مدیر

محمد منظور نعمانی

اپریل، مئی، جون سنہ ۱۹۷۷ء

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

وفیات نمبر

چالیس سالہ فائلوں کے تعزیتی مضامین

مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی

چندہ	قیمت	غیر ممالک سے
سالانہ — ۱۵/ روپے	پانچ روپے	سالانہ — دو پونڈ
عام شمارہ کی قیمت — ۱/۵۰		(بذریعہ بحری ڈاک)

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے
براہ کرم آئندہ کے لئے سالانہ چندہ مبلغ پندرہ روپے ارسال کریں۔ اگر خریداری جاری رکھنے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً مطلع فرمادیں، ورنہ اگلا شمارہ بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا
● براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس، [illegible] لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱- نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

سنہ ۷۴ء، سنہ ۷۵ء اور سنہ ۷۶ء کے تین انتخاب نمبروں کے بعد "وفیات نمبر" کے عنوان سے الفرقان کا یہ چوتھا انتخاب نمبر اللہ کی مدد اور توفیق سے ہدیۂ ناظرین ہے۔

گزشتہ سال الفرقان کے تیسرے انتخاب نمبر میں، جب یہ اعلان کیا گیا کہ یہ اس انتخابی سلسلہ کا آخری خاص نمبر ہے تو ناظرین کرام میں سے بعض مخلصوں نے یہ مشورہ دیا کہ چوں کہ اس سلسلۂ انتخاب میں وہ تعزیتی مضامین شامل نہیں کئے گئے جو مشاہیر اکابر دین و ملت یا دوسرے ممتاز حضرات کی وفات پر ادارہ کی طرف سے الفرقان میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے، لہٰذا وہ تمام مضامین بھی اسی طرح ایک خاص نمبر کی شکل میں شائع کر دیئے جائیں ــــــ اُس وقت اِس بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکا تھا ــــــ بعد میں جب وفیات کے سلسلے کے مضامین کو اس نظر سے دیکھا گیا تو اندازہ ہوا کہ ان کو یکجا کر دینے سے ہمارے دَور کے بہت سے اکابر و اعیان کا ایک اچھا اور پُر تاثیر تذکرہ تیار ہو جائے گا جس کا مطالعہ ناظرین کے لئے اور خاص کر آئندہ نسلوں کے لئے ان شاء اللہ بہت نفع مند ہوگا۔ چنانچہ فیصلہ کر لیا گیا اور اب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ناظرین کے لئے نافع بنائے اور قبول فرمائے۔

اس نمبر سے متعلق چند ضروری باتیں

۱۔ اس نمبر میں اب سے پانچ سال پہلے (سنہ ۱۳۹۲ھ مطابق سنہ ۱۹۷۲ء) تک کے تعزیتی مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ قریبی پانچ سال میں جو مضامین اس سلسلے کے لکھے گئے ہیں اُن کا اس مجموعہ میں شامل کرنا عدم گنجائش کے علاوہ اس لئے بھی ضروری نہیں سمجھا گیا کہ الفرقان کے موجودہ قریباً سب ہی ناظرین کی نظر سے وہ گزر چکے ہوں گے اور اکثر حضرات کے پاس محفوظ بھی ہوں گے۔

۲۔ اس نمبر میں مضامین اسی ترتیب سے مرتب کیے گئے ہیں جس ترتیب سے وہ الفرقان میں شائع ہوئے تھے صرف ابتدا میں ایک تصرف مناسب سمجھا گیا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ سے متعلق مضمون جو ترتیب و اشاعت کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر تھا، اس مجموعہ میں اسے پہلے نمبر پر کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اگست ۱۹۶۲ء (۱۳۸۲ھ) میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی وفات پر مدیر الفرقان نے جو مبسوط مضمون لکھا تھا وہ اس وقت ہفتہ وار "ندائے ملت" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا اور چونکہ اس دور میں "الفرقان" اور "ندائے ملت" کے ناظرین کا حلقہ بہت کچھ مشترک تھا اسلئے الفرقان میں اسے شائع نہیں کیا گیا تھا اور مولانا مرحوم کے متعلق صرف مختصر نوٹ لکھ کر ندائے ملت کے مضمون کا حوالہ دے دیا گیا تھا۔ اس مضمون کی خاص اہمیت کے پیش نظر ارادہ تھا کہ اس "وفیات نمبر" میں اس کو بھی شامل کر دیا جائے گا تاکہ وہ الفرقان کے صفحات میں محفوظ ہو جائے اور ہمارے اس دور کے ناظرین کی نظر سے بھی گزر جائے لیکن صفحات میں گنجائش نہ نکل سکنے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ اب ارادہ کیا گیا ہے کہ مولانا مرحوم سے متعلق اس مضمون کو اور وفیات کے سلسلے کی بعض اہم چیزوں کو انشاء اللہ الفرقان کے اگلے شمارہ میں شائع کر دیا جائے گا، اس طرح آئندہ شمارہ اس "وفیات نمبر" کا "تکملہ" یا "ضمیمہ" ہو جائے گا۔

۴۔ الفرقان کے اس سے پہلے شمارہ میں "وفیات نمبر کی ایک جھلک" کے زیر عنوان جن اکابر و مشاہیر کے اسمائے گرامی لکھے گئے تھے ان میں آخری نام شہید مظلوم شاہ فیصل بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا تھا یعنی اعلان کیا گیا تھا کہ شاہ مرحوم سے متعلق جو تعزیتی مضمون انکے حادثۂ شہادت پر الفرقان میں لکھا گیا تھا، وہ بھی وفیات نمبر میں شامل ہو گا، لیکن بعد میں یاد آیا کہ وہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والے "دوسرے انتخاب نمبر" ہی میں "نگاہِ اولیں" کے زیر عنوان لکھا گیا تھا اور ناظرین الفرقان کے پاس یقیناً محفوظ ہو گا، اس لئے اس کا اس چوتھے انتخاب نمبر میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

۵۔ حسب معمول سابق یہ وفیات نمبر بھی خریدار حضرات کی موجودہ تعداد سے زیادہ چھپوایا جا رہا ہے تاکہ دوسرے شائقین بھی منگوا سکیں۔ اس کی قیمت بھی پچھلے انتخاب نمبر ہی کی طرح پانچ روپے رکھی گئی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ پڑھے لکھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو یہ نمبر تحفہ کے طور پر دیں تو یہ آپ کا بہت اچھا اور دین کے لحاظ سے بہت نافع ہدیہ اور تحفہ ہو گا۔ انشاء اللہ الفرقان کی طرف سے بھی بہت سے حضرات کو یہ نمبر ہدیہ اور تحفہ کے طور پر بھیجا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس سے دینی نفع پہنچائے

ناظم۔ الفرقان لکھنؤ

ملحوظہ اس مجموعہ میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے متعلق مضمون غلطی سے مرتب کی منشاء کے خلاف ترتیب سے آگے ہو گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصّٰلحٰت

الفرقان کے انتخابی سلسلہ کا یہ چوتھا خاص شمارہ "وفیات نمبر" ناظرین کی خدمت میں پیش ہے، اس میں قریباً وہ سب مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں جو کسی کی وفات پر اب سے پانچ سال پہلے تک (یعنی ۱۳۹۲ھ م ۱۹۷۲ء تک) الفرقان میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کو کتابت کے لئے دینے سے پہلے راقم سطور نے اس وقت بھی پڑھا۔ اس کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اگرچہ ان میں زیادہ تر اس عاجز ہی کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں، تاہم اس وقت ان کے پڑھنے سے مجھے بڑا دینی نفع پہونچا، دل متاثر ہوا، آنکھیں بار بار روئیں، اپنی موت یاد آئی، بلکہ بعض اوقات گویا سامنے کھڑی ہوئی، اور اس کے لئے تیاری کی فکر پیدا ہوئی ــــــ اللہ تعالیٰ اپنے خاص کرم سے ناظرینِ کرام کے دلوں میں بھی یہ فکر پیدا فرمائے اور ہم سب کو قبر اور آخرت کے لئے تیاری کی توفیق عطا فرمائے کہ سب کو دیر سویر وہیں جانا ہے ــــــ

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ

آج ان سطروں کا لکھنے والا بھی یقیناً ایک دن مرنے والا ہے، وہ دن اور وہ گھڑی بس اللہ ہی کو معلوم ہے۔ جب بھی وہ وقت آئے گا تو اپنے بارہ میں نہ کچھ لکھا جا سکے گا، نہ کہا جا سکے گا، شاید دوسرے ہی لوگ کچھ کہیں یا لکھیں گے جو میرے حال سے پورے واقف بھی نہ ہوں گے۔ اس لئے

میں نے مناسب سمجھا کہ اس وفیات نمبر کے نگاہ اولیں کے ان صفحات میں خود ہی اپنے بارہ میں کچھ لکھ دوں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۔

قمری حساب سے میری عمر کا ۷۴، واں سال ہے اور شمسی حساب سے ۷۲، واں چل رہا ہے، اس لئے بظاہر بہت زیادہ وقت باقی نہیں ہے ـــــ تاہم جو کچھ باقی ہے اللہ تعالیٰ اس میں توبہ و انابت اور تلافیٔ مافات کی توفیق عطا فرمائے۔

ابتک جو طویل عمر اور مہلت ملی (بغیر ادنیٰ تواضع اور انکسار کے عرض کرتا ہوں) اس کو بہت ضائع اور برباد کیا ـــــ ربِ کریم کی طرف سے ہر طرح کے انعامات سے بے حساب نوازا گیا ـــــ ایسے گھرانے میں پیدا فرمایا جہاں دنیا بھی تھی اور دین بھی تھا، پھر والد ماجد کو توفیق دی کہ انھوں نے للّٰہیت اور آخرت طلبی ہی کے جذبہ سے مجھے دینی تعلیم میں لگانے کا فیصلہ فرمایا، پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی نے دینی تعلیم کی تکمیل، خاص کر حدیث شریف کی تحصیل کے لئے اب سے نصف صدی پہلے کے "دارالعلوم دیوبند" میں پہونچایا، جو اس وقت دینی تعلیم و تدریس بالخصوص علم حدیث و سنت اور اس کے مطابق زندگی کی جماعت کا بے مثال نمونہ اور مرکز تھا، اور امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ محدث کشمیری قدس سرہٗ جیسے علم کتاب و سنت اور شریعت و طریقت کے جامع اساتذہ مسندِ تدریس کی زینت تھے ـــــ پھر اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ علم بھی نصیب فرمایا۔ پھر اسی کے ساتھ یہ عظیم ترین نعمت بھی عطا فرمائی گئی کہ اس نصف صدی کی پوری مدت میں جن اللہ والوں کو پایا، اُن سب کی عقیدت و محبت اور اُن کی طرف سے بے استحقاق غیر معمولی شفقت و عنایت نصیب ہوئی، اُن کی خدمت میں حاضری کی توفیق بھی ملی۔ استفادہ ہی کی نیت سے کبھی کبھی کسی قدر طویل قیام بھی نصیب ہوا ـــــ کچھ ذکر شغل کی بھی توفیق ملی ـــــ لیکن اپنی شومیٔ قسمت اور بے استعدادی کی وجہ سے ان کی اصل دولت نسبتِ احسانی اور تزکیۂ اخلاق کی نعمت سے محرومی کی حسرت کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکا ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل ۔۔۔ کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

بظاہر خدمتِ دین کے مختلف شعبوں سے تعلق بھی نصیب رہا، قرآنِ مجید اور حدیث شریف کے درس و تعلیم کے بہت اچھے مواقع عطا فرمائے گئے، دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف، مضامین و مقالات

اور تقریر و بیان کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کی بھی توفیق ملی، اور ان راہوں سے خوب شہرت بھی حاصل ہوئی۔
—— لیکن اپنے اندر کا حال یہ ہے کہ ان کاموں کی عند اللہ مقبولیت کی جو اوّلین شرط ہے یعنی صرف رضائے الٰہی کی نیت اور اخلاص و احتساب، اُس کے بارے میں کبھی اطمینان حاصل نہ ہو سکا —— اور معلوم ہے کہ خدمتِ دین کے ان کاموں میں اگر اخلاص نہ ہو تو یہ سب منھ پر مار دیے جانے کے لائق ہیں، بلکہ یہی دینی کام (جو بظاہر نیابتِ نبوت کے سلسلے کے مقدس کام ہیں) اگر دنیا طلبی یا عند الناس مقبولیت و شہرت کے لئے کئے جائیں (تو جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مروی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث سے معلوم ہوتا ہے تو یہی کام) دوسرے سب گناہوں سے پہلے جہنم میں ڈلوانے والے بدترین گناہ ہیں —— اعاذنا اللہ تعالیٰ من ذالک۔

اس طویل زندگی میں بے گنتی واعظانہ اور مصلحانہ تقریریں کیں، ہزاروں کو گناہوں سے توبہ اور اللہ و رسول کی فرمانبرداری، اتباعِ شریعت و سنت اور گناہوں سے بچنے کی خوب تلقین و تاکید کی، پورے ۵۰ سال کی مدت میں الفرقان ہی کے صفحات میں سیکڑوں دینی و اصلاحی مضامین و مقالات لکھے ——
لیکن پوری سچائی کے ساتھ اپنی اس کوتاہی اور بدنصیبی کا اقرار ہے کہ ایک مومنِ صادق اور داعیٔ حق کے قول و عمل اور حال میں جو مطابقت اور یکسانی ہونی چاہئے اس میں ہمیشہ بے حد و بے حساب کمی محسوس ہوئی —— اگر خدانخواستہ "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" والا مواخذہ ہوا تو کوئی عذر اور جواب نہ ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ اس حال کی اصلاح فرمائے اور اب تک کی تقصیرات کو اپنے رحم و کرم سے معاف فرمائے —— اَللّٰھُمَّ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ:

انکار ۱ سلوک اپنے فہم و فکر پر زیادہ اعتماد اور اس کے ساتھ فیصلہ اور اقدام میں جلد بازی بھی میری بری عادتوں میں سے رہا ہے اور اس نے زندگی میں بڑی بڑی غلطیاں کرائی ہیں، لیکن احساس ہو جانے پر اللہ تعالیٰ نے رجوع اور اصلاح کی بھی توفیق دی، فلہ الحمد و لہ الشکر —— اگر میں نے کبھی کوئی ایسی بات کہی یا لکھی ہے یا کوئی ایسا اقدام کیا ہے جو علمائے راسخین و ربانیین کی عام رائے کے خلاف ہے تو اس کو غلط اور مرجوع عنہ سمجھا جائے۔

الحمد للہ نماز، روزہ جیسے فرائض کی کم از کم ظاہری ادائیگی نصیب رہی ہے اسی طرح وہ گناہ جو عوام میں ...

جن کو شریعت کی خاص اصطلاح میں "کبائر و فواحش" کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے ان سے بھی بڑی حد تک محفوظ رکھا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ ظاہر و باطن کے طرح طرح کے گناہوں میں اپنے کو سر سے پاؤں تک لوث دیکھتا ہوں، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ و استغفار کی توفیق بھی ملتی ہے اس لئے ارحم الراحمین کی رحمت سے معافی اور مغفرت کی امید رکھتا ہوں ——— انشاء اللہ الرحیم الکریم اُس زُمرہ میں شامل کر دیا جاؤں گا جن کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے[1] "وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ" ——— (آل عمران۔ ع ۱۴)

دینی اور آخرتی نقطۂ نظر سے میری نہایت مہلک اور خطرناک بیماری یہ ہے کہ اخلاقی رذائل، حُبِّ جاہ، ریا، کبر، غصّہ اور اُس کے نتیجہ میں بندگانِ خدا کی دل آزاری، اور غرباء و مساکین سے کم آمیزی اور اُن کی محبت و ملاطفت سے محرومی جیسے رذائل کی جڑیں دل کی گہرائی میں جمی ہوئی ہیں، حالانکہ یہ شیطانی معاصی ہیں جو زنا، شراب جیسے حیوانی معاصی سے بھی زیادہ خطرناک ہیں ——— اللہ تعالیٰ ہی میں قدرت ہے کہ وہ ان خبیث امراض کی جڑوں کو دل سے نکال کے مرنے سے پہلے قلب و روح کو پاک فرما دے۔

اللھم اھدنی لاحسن الاعمال والاخلاق انہ لا یھدی لاحسنھا الا انت واصرف عنی سیئھا لا یصرف عنی سیئھا الا انت۔

وصیت

جیسا کہ عرض کیا گیا قمری حساب سے میری عمر کا ۷۴، واں سال چل رہا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ

---

[1] آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ایسے قصوروار بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ معاف فرما کر نیکوں کے ساتھ جنت میں داخل فرما دے گا جن کا حال یہ رہا ہو گا کہ جب انھوں نے کوئی شرمناک حرکت یا گناہ کیا تو ان کو اللہ یاد آیا اور انھوں نے معافی مانگی اور گناہ گاری پر قائم اور مصر نہ رہے تو ایسے قصوروار گناہگار بھی بخش دیئے جائیں گے۔ ۱۲

زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ حدیث شریف میں وصیت کرنے کا سخت تاکیدی حکم ہے ـــــ اس عاجز نے اپنے خانگی اور مالی معاملات سے متعلق ایک یادداشت "وصیت نامہ" ہی کے طور پر، گزشتہ رمضان مبارک میں شدید بیماری کی حالت میں جبکہ میں اسپتال داخل تھا، لکھائی تھی لیکن وہ ناتمام اور نامکمل تھی، اب اُس پر نظر ثانی اور ممکن حد تک اس کی تکمیل کر کے گھر والوں کے لئے محفوظ کر دینے کا ارادہ ہے، اللہ تعالےٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اس کے علاوہ کچھ باتیں عام دینی نصیحت اور خیر خواہی کی عرض کرنا بھی اپنا فرض سمجھ کر **عمومی وصیت** کے طور پر یہاں لکھتا ہوں :ـــــ

اللہ تعالیٰ کے فرمان "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" اور "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" کی تعمیل کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنے نفس اور اپنی ذات کو، اُس کے بعد اپنی اولاد، اپنے عزیزوں، دوستوں اور درجہ بدرجہ سب اہلِ تعلق کو اور اُس کے بعد اُن سب اہلِ ایمان کو جن تک میری بات پہونچ سکے، میری وصیت ہے کہ :

قرآن مجید اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم وہدایت کے مطابق خالص توحید پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور اس یقین اور دھیان کے ساتھ شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے۔ ہمارا ظاہر و باطن ہر لحہ اس کے سامنے ہے اور مرنے کے بعد اُس کے سامنے پیش ہونا اور پوری زندگی کا حساب دینا ہے۔

اہتمام کے ساتھ شریعت کے عائد کیے ہوئے فرائض کو ادا کریں، خصوصاً نماز با جماعت کی پابندی کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں (اگر نماز نہیں تو گویا ایمان نہیں) ـــــ جن چیزوں کو اللہ و رسول نے ناجائز و حرام قرار دیا اور منع فرمایا ہے اُن سب سے، خاصکر کبائر اور فواحش سے اپنے کو بچانے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہیں، اگر اغوار شیطانی یا اپنے شریر نفس کے تقاضے سے گناہ ہو جائے تو سچے دل سے توبہ و استغفار کریں، اللہ تعالیٰ ضرور مغفرت فرما دے گا۔ اس کا ارشاد ہے :ـ

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء ع ۱۶)	جو کوئی بندہ بُرا کام کرے یا اللہ کی نافرمانی کرکے اپنے نفس پر ظلم کرے، پھر اللہ سے معافی مانگے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان پائیگا۔

اگر خدانخواستہ توبہ و استغفار کے بعد پھر گناہ ہو جائے اور بدبختی سے بار بار ہو جائے تب بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اگر ہزار بار گناہ کر کے بھی بندہ سچے دل سے توبہ کرے گا اور اللہ سے معافی مانگے گا تو وہ رحیم و کریم معاف فرمائے گا ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　گر ہزار بار توبہ شکستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست

عمر کا بڑا حصہ غفلت اور گناہوں میں گزارنے کے بعد بھی اگر توبہ و استغفار اور اصلاح حال کی توفیق ملے تو کچھ نہیں گیا ــــ اولیاء اللہ میں ہزاروں وہ ہیں جن کی زندگی کا بڑا حصہ غفلت بلکہ فسق و فجور میں گزرا پھر جب اُن کے اندر ایمانی احساس جاگا اور انھوں نے اپنے کو شیطان کے پنجے سے نکال کر خدا کے راستہ پر ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو مقام ولایت تک پہونچا دیا ــــ ایسے لوگوں کیلئے پہلا قدم یہ ہے کہ وہ نماز باجماعت کی پابندی کرنے لگیں، اللہ کے ایسے بندوں سے قریب ہوں جو اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر رکھتے ہوں ــــ انسان کی زندگی پر سب سے زیادہ اچھا یا بُرا اثر ڈالنے والی چیز صحبت ہے ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　صحبتِ طالح ترا طالح کند

جن لوگوں نے بظاہر خدا سے بے تعلقی اور آخرت کی طرف سے بے فکری والی زندگی ہی کو اپنا لیا ہے اور اسی میں وہ مست و مگن ہیں، بخدا وہ بدترین قسم کی خودکشی کر رہے ہیں۔ اگر وہ میرے قریبی عزیز بھی ہوں، تو میں اُن سے بری ہوں ــــ اُن کو بہت ڈرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ توبہ و اصلاح کی توفیق سے بلکہ ایمان سے بھی ان کو محروم نہ کر دے ــــ اُس کو کسی کی پروا نہیں وہ غنیٌّ عن العٰلمین ہے، اسکی بندگی اور فرمانبرداری خود ہماری ضرورت ہے ــــ ابوطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق اور محسن چچا تھے لیکن جب انھوں نے اپنے لئے ایمان کو پسند نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی (رسول اللہ ؐ کی خواہش کے باوجود) اُن کے لئے ایمان پسند نہیں فرمایا اور یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ

حقوق العباد

یہاں تک جو کچھ عرض کیا اُس کا تعلق حقوق اللہ سے تھا، حقوق العباد کا معاملہ اس حیثیت سے زیادہ اہم اور قابل فکر ہے کہ اس میں اگر تقصیر اور کوتاہی ہو جائے، یعنی کسی بندہ کی ہم سے حق تلفی یا اس پر ظلم و زیادتی ہو جائے تو اس سے نجات کا اور سبکدوشی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے (جو رحیم و کریم ہے) اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا ہے، بلکہ

اُسکی صورت صرف یہی ہے کہ یا تو اُس مظلوم بندہ کو اسی دنیا میں اس ظلم و زیادتی کا بدلہ اور معاوضہ دے کر سبکدوشی حاصل کی جائے یا معاف کرالیا جائے ـــــ اگر ان دونوں میں سے کوئی بات بھی یہاں نہ ہوسکی تو آخرت میں خدانکردہ سخت عذاب بھگتنا ہوگا ـــــ صحیح بخاری شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد مروی ہے جس کا حاصل ترجمہ یہ ہے کہ:ـــــ

"جس کسی نے کسی دوسرے بندہ پر ظلم و زیادتی کی ہو اُس کی آبروریزی کی ہو یا اس کا کوئی حق مار لیا اور دبا لیا ہو تو اُس کو چاہیئے کہ اس زندگی ہی میں اس سے معاملہ صاف کرلے قیامت کے اُس دن کے آنے سے پہلے جب اس کے پاس ادا کرنے کے لئے روپیہ پیسہ کچھ نہ ہوگا ـــــ اگر اُس کے پاس اعمال صالحہ ہوں گے تو اسکے ظلم اور حق ماری کے بقدر اس مظلوم کو دلوا دیئے جائیں گے اور اگر وہ اعمال صالحہ سے بھی خالی ہاتھ ہوگا تو مظلوم کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے (اور وہ جہنم میں اسکی سزا بھگتے گا)

الغرض حقوق العباد کا معاملہ بہت زیادہ قابل فکر ہے لیکن زندگی اور معاشرت بگڑ جانے کی وجہ سے فی زمانا بہت سے دیندار اور عبادت گذار بھی حقوق العباد کے معاملہ میں بہت کوتاہیاں کرتے ہیں ـــــ یہ عاجز سب سے پہلے اپنے نفس، اپنی اولاد، اپنے عزیزوں، دوستوں اور اہل تعلق کو اور سب اہلِ ایمان کو اس بارہ میں خصوصیت سے وصیت اور تاکید کرتا ہے۔ اگر کسی بندہ کا کوئی مالی یا غیر مالی حق ہمارے ذمہ ہے تو اس کو ادا کرنے یا معافی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا اپنے پر عظیم ظلم اور اپنے ساتھ شدید دشمنی ہے۔

اس عاجز سیاہ کار کا زندگی میں جن حضرات سے تعلق اور واسطہ رہا ہے اُن میں سے بہت سوں کی میری کسی بات یا کسی عمل سے دل آزاری ہوئی ہوگی، بہت سوں کی غیبت کی ہوگی دل نے بہت سوں کے بارہ میں بدگمانی کی ہوگی یا اسی طرح کی کوئی اور کوتاہی اُن کے بارہ میں مجھ سے ہوئی ہوگی ـــــ تو جن حضرات تک میری یہ گذارش پہونچ جائے، اپنی اس تحریر کے ذریعہ میں اُن سب سے اللہ کیلئے معاف کردینے کی استدعا کرتا ہوں، وہ اللہ کے واسطے مجھے معاف فرمادیں، مجھ پر ان کا یہ بہت ہی بڑا احسان ہوگا اور وہ اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے ـــــ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین ـــــ اور اگر اس طرح کے حقوق کسی مسلمان بھائی پر بالفرض میرے ہوں تو میں نے اللہ سے اجر کی امید رکھتے ہوئے ان کو بالکل سبکدوش کردیا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کسی عزیز یا دوست کا مجھ پر قرض یا کوئی اس طرح کا مالی حق باقی نہیں ہے۔ اگر بالفرض کسی صاحب کا ہو تو وہ مجھے بتلادیں اور یاد دلادیں، اگر ایسا ہوگیا تو انشاء اللہ ضرور ادا کردیا جائے گا

اور میں ان کا ممنون ہوں گا۔ اور جن حضرات کے ذمہ میرا کوئی مالی حق باقی ہے، اگر اُن کے لیے ادائگی مشکل ہو تو مجھ سے گفتگو یا خط و کتابت کرلیں انشاء اللہ ان کے لئے سہولت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔"

الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے سلسلہ کے حقوق

قریباً ۶۴ سال سے الفرقان جاری ہے اور اُس کے ساتھ کسی نہ کسی پیمانہ پر کتابوں کی فروخت کا سلسلہ بھی رہا ہے ۔ اور بہت مدت سے میں ان دونوں سلسلوں کے معاملات سے خود تعلق نہیں رکھتا، لیکن دین کے علاوہ معاملات دوسرے ہی کارکن کرتے رہے ہیں، لیکن بلاشبہ مالکانہ حیثیت سے ذمہ داری میری رہی ہے۔ قریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں یقیناً ہزاروں "بندگان خدا" الفرقان یا کتابوں کے خریدار رہے ہوں گے ۔ اگرچہ میں کارکنوں کو ہمیشہ تاکید کرتا رہا ہوں کہ کسی کا کوئی حق ہمارے ذمہ باقی نہ رہ جائے لیکن غالب گمان یہی ہے کہ کم از کم نادانستہ یا غفلت و لاپروائی سے بہت سے بندگان خدا کے ساتھ معاملہ میں کوتاہی یا اُنکی کوئی حق تلفی ہوئی ہوگی، اور ان کا کوئی حق رسالہ یا کتب خانہ کے سلسلے میں باقی رہ گیا ہوگا ۔ اسلئے میں ایسے سب حضرات سے جن کا کوئی حق دفتر الفرقان یا کتب خانہ الفرقان کے ذمہ باقی رہ گیا ہو، گزارش کرتا ہوں کہ وہ مجھے مطلع فرما کر اپنا حق وصول کرلیں ۔ یہ ان کا مجھ پر احسان ہوگا ۔ اور اگر شرافت و مروت کی وجہ سے اس میں اُنکو تکلف ہو تو ارادہ کے ساتھ لوجہ اللہ معاف فرما دیں اور اسطرح آخرت کے مواخذہ سے مجھے سبکدوش کردیں۔

میری ایک وصیت یا گذارش یہ ہے کہ میرے انتقال کے بعد میرے نجی خطوط شائع نہ کیے جائیں ۔ اگر کسی خط کی اشاعت میں کوئی خاص افادیت سمجھی جائے تو میرے بڑے لڑکے مولوی عتیق الرحمان کو خط دکھا کر ان کی اجازت سے شائع کیا جائے۔

دعائے مغفرت کی التجا

عزیزوں، دوستوں اور سب مسلمان بھائیوں سے، جن تک میری بات پہونچ سکے، آخری گزارش اور التجا یہ ہے کہ دعائے مغفرت کا مجھے انتہائی درجہ میں حاجت مند سمجھ کر جب بھی توفیق ہو میرے لئے مغفرت و رحمت کی دعا کریں ۔ انشاء اللہ اس کے صلہ میں آپ کے لیے اللہ کے مقرب فرشتے مغفرت و رحمت کی دعا کریں گے ۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی بندہ اپنے کسی مسلمان بھائی کے لئے غائبانہ کوئی دعا کرتا ہے تو فرشتے "آمین" کہتے ہیں اور اسی کے ساتھ کہتے ہیں کہ "ولک مثل ذالک" یعنی تجھے بھی اللہ تعالیٰ وہ عطا فرمائے جو تو اپنے مومن

بھائی کے لئے مانگ رہا ہے — والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین وسلام علی المرسلین

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ - م - ۱۲ مئی ۱۹۷۷ء

اپنا حال

الحمد للہ قریباً ۹ مہینے کے بعد اس خاص شمارہ کیلئے تحریر۔ اولیں اپنے قلم سے لکھا ہے اس سے پہلے املاءً دوسروں سے لکھاتا رہا ہوں — میری علالت کا سلسلہ گزشتہ رمضان المبارک کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ قریباً دو مہینے بلڈپریشر اور بخار کے تسلسل کی وجہ سے علالت کی نوعیت معالجین کے نزدیک تشویشناک رہی پھر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں باقی نہیں رہیں۔ لیکن ٹانگ میں جو شدید تکلیف اس علالت کے آغاز ہی سے پیدا ہوگئی تھی اسمیں اگرچہ تخفیف ہوتی رہی لیکن وہ برابر باقی رہی۔ قریباً چھ مہینے تک معالجین کی رائے یہ رہی کہ ہڈی میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی صرف ورم آگیا ہے اس کی وجہ سے یہ تکلیف ہے۔ اسی بنیاد پر وہ علاج کرتے رہے اور تکلیف میں کسی قدر کمی بھی ہوتی رہی، یہاں تک کہ میں بیٹھ کر رکوع سجدے کے ساتھ نماز ادا کرنے لگا، اور فرلانگ دو فرلانگ کے قریب چلنے بھی لگا۔ لیکن اس چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ معالجین کہتے رہے کہ آہستہ آہستہ یہ تکلیف بھی جاتی رہے گی اور چلنا پھرنا معمول کے مطابق ہو جائے گا۔ لیکن ادھر قریباً دو تین مہینے سے اس میں کوئی مزید تخفیف اور کمی نہیں ہوئی۔ تو صورت حال کو سمجھنے کے لئے آخر مارچ میں پھر ایکسرے کرایا گیا، اس کو دیکھ کر معالج ڈاکٹر نے بتلایا کہ معاملہ کے سمجھنے میں شروع میں غلطی ہوئی۔ کولہے کی جو ہڈی تین سال پہلے ایکسیڈنٹ میں ٹوٹی تھی وہی پھر کسی وجہ سے ٹوٹ گئی تھی (اور بلڈپریشر بھی اسی وجہ سے ہوا تھا) اور اس وقت ہڈی کا جو علاج ہونا چاہئے تھا تشخیص صحیح نہ ہو سکنے کی وجہ سے وہ علاج نہیں ہوا — اب جو بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اس کا پورا علاج اور پوری اصلاح آپریشن سے ہی ہو سکتی ہے — اب میرے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ حالت ہی کے ساتھ باقی زندگی حتی الوسع احتیاط سے گھر کے اندر ہی گزارنے کا فیصلہ کر لیا جائے — جیسا کہ عرض کیا گیا اپنی ضرورتوں کے لئے کسی قدر تکلیف اور تکلف کے ساتھ چل لیتا ہوں، نماز بیٹھ کر ادا کر لیتا ہوں — دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہڈی کا آپریشن کرایا جائے اور مصنوعی ہڈی کا جوڑ لگوایا جائے۔ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ ڈاکٹروں سے مشورہ جاری ہے۔ جس میں میرے لئے دنیا اور آخرت کی خیر ہو اللہ تعالیٰ اسکی طرف رہنمائی فرمائے اور اسکو آسان اور مقدر فرمادے۔ اپنے مخلصین سے بھی اسی دعا کی استدعا ہے —

نعمانی

محمد منظور نعمانی

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ

(رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان (اب تک جن کے نام نامی کے ساتھ "ظلہ اور دامت برکاتہم" کہنے اور لکھنے ہی کی زبان اور قلم کو عادت رہی ہے اور آج پہلی بار اُن کی رُوح پاک کے لیے رحمت و رضوان کی دعا زبان قلم سے نکل رہی ہے) آپ کے وصال کی اطلاع ہمارے ناظرین کرام کو اب سے بہت پہلے مل چکی ہوگی۔ (حضرت حکیم الامت ۱۵ ار رجب ۱۳۶۲ھ کو واصل بحق ہوئے)

کسی بابرکت بزرگ کا اس دنیا سے اُٹھ جانا تاریخ کا کوئی نادر واقعہ نہیں ہے اللہ کے جن ہزارہا برگزیدہ بندوں کے نام عظمت و احترام کے ساتھ ہماری زبانوں پر آتے ہیں اور علیہ الصلوٰۃ والسلام یا رضی اللہ عنہ یا قدس سرہٗ یا رحمۃ اللہ علیہ جیسے کلمات سے جن کی عظمت و برگزیدگی کا اعتراف اور ان کے لیے دعائے خیر ہم کرتے ہیں وہ سب وہی ہیں جو اس دنیا میں تھے اور اللہ کے مقررہ قانون کے مطابق اپنی مدت حیات ختم کر کے اور اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دے کر اس عالم سے سدھار چکے ہیں۔

تاہم دین کی غربت اور فتنوں کی کثرت کے اس زمانہ میں اللہ کے کسی صالح اور مصلح بندے اور دین کے کسی ممتاز خادم کا اُٹھ جانا یقیناً غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ عام حالت یہی ہے کہ اب جو جاتا ہے پھر اس کی جگہ پر ہوتی نہیں دکھائی جاتی اور معلوم ہوتا ہے کہ حدیث بخاری یذھب الصالحون الاول فالاول وتبقی حفالۃ کحفالۃ الشعیر والتمر لایبالیھم اللہ[1]" کی پیشین گوئی اسی طرح تدریجاً عمل میں آرہی ہے۔

---

[1] "صالحین" یکے بعد دیگرے برابر اٹھتے چلے جائیں گے اور جو یا کھجور کے کوڑے کرکٹ کی طرح نکمے اور خراب آدمی ہی باقی رہ جائیں گے۔ اللہ کے یہاں جن کی کوئی پرواہ نہ ہوگی۔

یہ حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں علم و ارشاد کے اعلیٰ درجوں کی جو جامعیت اللہ پاک نے حضرت حکیم الامت کو عنایت فرمائی تھی وہ خواص کے حصہ میں بھی بہت کم آتی ہے۔ لیکن یہاں اس وقت آپ کے خصائص و کمالات کا بیان مقصود نہیں ہے ورنہ اگر اس کا ارادہ کیا جائے تو حضرت مرحوم کے جو قابل ذکر احوال اس عاجز کو براہ راست اور بلا واسطہ معلوم ہیں انہی سے ایک پوری کتاب بلکہ انشاء اللہ کئی جلدوں والی کتاب تیار ہو سکتی ہے ——
اس وقت تو صرف اپنے نفس اور اپنے اُن بزرگوں اور دوستوں کے لیے جو اس صدمہ سے محزون و مغموم ہیں چند تعزیتی کلمات ہی لکھنے کے واسطے قلم اٹھایا ہے۔

بزرگو! اور دوستو!! آپ کا صدمہ یقیناً بجا اور حزن وغم بیشک برمحل، یقیناً ایسے "مربی" کا سایہ سر سے اُٹھ جانے پر یہ حزن والم بالکل فطری چیز ہے —— لیکن ہاں صدمہ وغم کی ان گھڑیوں میں بھی بھول نہ جائیے اللہ کے اس خاص فضل و کرم کو، بلکہ صبر کے ساتھ ہی شکر بھی ادا کیجیے رب کریم کے اس احسان کا کہ اُس نے حضرت حکیم الامت (علیہ الرضوان والرحمۃ) کو کافی عمر عطا فرمائی اور علاوہ دیگر دینی خدمات کے تصنیف و تالیف کی طرف آپ کو خاص طور سے متوجہ فرمایا اور پھر آپ کی اُن تالیفات کی طبع و اشاعت کا بھی ایسا انتظام فرمایا کہ گو آج حضرت اپنے جسم مبارک کے ساتھ ہم میں نہیں ہیں لیکن الحمد للہ کہ آپ کے علمی و ارشادی فیوض کا اتنا مکمل ذخیرہ ہمارے استفادہ اور رہنمائی کے لیے موجود ہے کہ یہ کہنا انشاء اللہ مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت مرحوم اپنے فیوض و برکات کے لحاظ سے اب بھی ہم سے جدا نہیں ہوئے ہیں۔ گویا اس حیثیت سے اللہ پاک نے آپ کو "بقاء ودوام" عطا فرما دیا ہے، اور کیوں نہ ہو

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

یقیناً ہمارے حق میں بھی یہ اللہ پاک کا بہت بڑا احسان اور انعام ہے اور اس کا حقیقی شکر یہی ہے کہ ہم اس سے (یعنی حضرت مرحوم کی دینی و ارشادی تالیفات سے) کماحقہٗ استفادہ کریں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہونچائیں۔ اس میں ایک پہلو تو ہمارے فائدہ کا ہے جو ظاہر ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ اس راہ سے جتنا بھی استفادہ کریں گے اور جس قدر بھی اس سلسلۂ خیر کو آگے بڑھائیں گے اس کا جس قدر ثواب آپ کو ملے گا حدیث صحیح "من دعیٰ الی حسنۃ الخ" کے اصول کے مطابق اتنا ہی حضرت حکیم الامت کے حساب میں ثبت کیا جائے گا۔ تو گویا آپ کی تالیفات سے استفادہ اور آپ کی تعلیمات پر عمل کرنا، آپ کے مدارج بڑھنے اور آپ کا مقام اور زیادہ بلند ہونے کا بھی ایک بہترین اور بے خطر ذریعہ ہے ——!

اور یہاں حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ سے خصوصی محبت و تعلق رکھنے والے بزرگوں اور دوستوں کی نظر سے حادثہ کا یہ پہلو بھی اوجھل نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہیے کہ حضرت مرحوم جس عالم میں تشریف لے گئے ہیں ان شاء اللہ وہ عالم حضرت کے لیے اس دار المحن سے ہزاروں درجہ بہتر اور خوش گوار ہوگا ـــــ آخر اس رحلت کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے جس نے "شوق وطن" لکھ کر ہزاروں کو موت کا مشتاق اور آخرت کے دیس کا شائق بنا دیا تھا وہ خود بھی اب اس "سرائے فانی" سے اپنے اسی جاودانی دیس کو چلا گیا، اور جس کی رضا جوئی کے لیے اور جس کی یاد میں راتوں کی نیند اور دنوں کا چین و آرام قربان کیا جاتا تھا، اب اُسی کے حضور میں اور اس کے مقام رضواں میں پہونچنا نصیب ہو گیا، ان کا وہ مولا اُن سے راضی اور وہ اس سے راضی، اور اور ہم سب کا بھی وہی والی اور وہی ہادی ـــــ حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولی ونعم النصیر ـــــ اُسی سے دعا ہے کہ حضرت مرحوم کو ہم سب کی طرف سے بہتر جزا دے اور اُن کی جدائی کے صدمہ کو ہمارے لیے باعث اجر بنا دے۔ ان فی اللہ عزاءً من کل مصیبۃ ودرکاً من کل فائت ..... باللہ فثقوا وایاہ فارجوا فانما المصاب من حرم الثواب۔

ان تعزیتی سطور کو ختم کرتے ہوئے ایک بات اپنے ناظرین کرام سے اور بھی عرض کرنی ہے :۔

بارہا مجھ پر یہ گزرا ہے کہ اکابر اُمت میں سے کسی کی کوئی خاص پر تاثیر تصنیف یا ان کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا یا کسی ذریعہ سے اُن کے خاص اصول سننے میں آئے تو دل میں حسرت کے ساتھ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہوتی ـــــ بالخصوص حضرت مجدد الف ثانیؒ امیر المومنین حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے متعلق بارہا یہ حسرت دل میں آئی ہے ـــــ تو کیا عجب کہ اسی طرح آئندہ بہت سے لوگ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کو بھی حسرت سے یاد کریں، اور اللہ کے جو خاص بندے ابھی باقی ہیں ان کے نہ رہنے کے بعد اُن کی بھی حسرت کے ساتھ بس یاد ہی رہ جائے۔

برادران دینی جانے والے جا چکے اور جو ابھی باقی ہیں وہ بھی ایک دن اسی طرح چلے جائیں گے اور یہ قریباً کلیہ سا ہو گیا ہے کہ جو جاتا ہے اس کی جگہ عموماً خالی ہی رہتی ہے ـــــ اس لیے جو خاص بندگانِ خدا اس وقت موجود ہیں، جن کی صحبت اللہ کی خشیت اور ایمانی حلاوت پیدا کرنے میں خاص اثر رکھتی ہے

اور جن کی نشانی حدیث نبوی میں یہ بتلائی گئی ہے کہ

من یذکرکم اللہ رؤیتہ ویزید فی	ان کو دیکھنا تمہارے اندر اللہ کی یاد کو تازہ کرے
الآخرۃ عملہ وینفعکم منطقہ	اور ان کے اعمال کا مطالعہ تم کو آخرت کی یاد دلائے
	اور ان کی گفتار سے تم کو نفع حاصل ہو۔

بہرحال ایسے جو بندگان خدا اس وقت موجود ہیں (اور اگرچہ ان کی تعداد اب بہت کم ہے تاہم اللہ کی زمین ابھی ایسے وجودوں سے خالی نہیں ہوئی ہے) تو چاہیے کہ ان ہستیوں کو غنیمت بلکہ اللہ کی نعمت سمجھا جائے اور ان کی صحبت سے حسب توفیق فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ کیا خبر کل کو ان میں سے بھی کون کون نہ رہے! ــــــ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ جا کر کسی "شیخ" سے "بیعت" ہی کر لیجیے! بلکہ میں جس چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ صحبت، اور استرشادی رابطہ ہے نہ کہ رسمی بیعت! اولئک قوم لا یشقی جلیسھم

آج تو پی لو خدا جانے کہ کل کیا حشر ہو
میکدہ اٹھ جائے یا ساقی مہرباں پھر نہ ہو

بقیہ صفحہ ۱۴۰

موجود تھیں مولانا کو لٹا یا گیا۔ لا الٰہ الا اللہ کا ورد مولانا کی زبان پر تھا۔ مولانا انعام الحسن صاحب اسی کار میں ساتھ تھے۔ باقی دوست آگے پیچھے دوسری کاروں میں۔ کچھ لوگ پہلے انتظامات کے لیے اسپتال پہونچ چکے تھے۔ راستے میں بس ایک بار دریافت فرمایا کتنی دور اور ہے۔ کہا بس پہونچ رہے ہیں۔ لیکن ابھی مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ کا فاصلہ اور رہا تھا کہ اس بے چین روح کو رحمت حق نے بڑھ کر اپنی آغوش میں لے لیا اور ادھر کار بھی ایک جھپاکے میں اسپتال کے اندر تھی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم دروازہ پر موجود جھٹ پٹ کار کا دروازہ کھلا۔ بتایا گیا ہونی ہو چکی مگر ڈاکٹروں نے اپنا آخری فرض ایک انجکشن دے کر ادا کیا کیونکہ جسم میں گرمی باقی تھی۔

یہ ہے اس داعی آخرت کے سفر آخرت کی مختصر روداد۔ ۳۰ ذی قعدہ مطابق ..... اپریل یوم شنبہ کو ۹ بجے صبح اپنے والد ماجد کے پہلو میں اسی مسجد کے احاطہ میں تدفین ہوئی جو آپ کا تبلیغی مستقر تھا ــــــ رہے نام اللہ کا

محمد منظور نعمانی

اچھی زندگی اور اچھی موت

عزیز بھائی الحاج محمود حسین کی یاد میں

(ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

"الفرقان" کے گزشتہ پرچہ کی کاپیوں کی تصحیح وغیرہ سے جس روز مجھے فراغت ہوئی غالباً اُسی روز میرے سب سے چھوٹے بھائی مولوی حکیم محمد احسن (سلمہم اللہ تعالیٰ) کا خط سنبھل سے آیا، جس میں علاوہ دوسرے امور کے یہ بھی مرقوم تھا کہ

"بھائی صاحب کو شنبہ کے روز سے بخار ہوگیا تھا، پرسوں سے وہ نمونیا کی جانب مائل ہوگیا ہے، مرض سخت معلوم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے"

یہ مجھ سے چھوٹے اور اُن سے بڑے بھائی (حاجی محمود حسین مرحوم) کی علالت کی پہلی اطلاع تھی جو کارڈ کے ذریعہ ۲۵ ذی قعدہ بروز شنبہ بریلی میں مجھے ملی، چونکہ کارڈ تین دن پہلے کا لکھا ہوا تھا اس لیے میں نے فوراً تار دلوایا کہ ــــ "بھائی محمود کی حالت سے فوراً اطلاع دو" ــــ اگلے روز (اتوار کے دن) جواب تار سے آیا کہ "ویسی ہی حالت ہے فوراً آجانا چاہیے"

میں دوشنبہ کی صبح کو یہاں سے روانہ ہوکر شام کے ۸ بجے سنبھل پہونچ گیا، دیکھا تو مرض کی تکلیف سخت تھی میں نے سلام کے بعد پوچھا ــــ "بھائی! کیا حال ہے؟" سانس کو قابو میں کرتے ہوئے جواب دیا "وعلیکم السلام، الحمدللہ، حال اچھا ہے، خدا کا شکر ہے آپ خاص وقت پہ آگئے" ــــ میں اس آخری لفظ سے بہت کھٹکا، اگرچہ مرض کی شدت اور نزاکت ظاہر تھی لیکن پھر بھی یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ آخری ہی علالت ہے اور وہ "خاص وقت" بھی اتنا قریب آچکا ہے۔ چنانچہ میرے پہنچنے سے ۲۴ ہی گھنٹے بعد ۲۸ ذیقعدہ کو قریب ۸ بجے شام روح نے جسم سے مفارقت اختیار کر لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ مجھ سے دو برس چھوٹے میرے حقیقی بھائی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ خصوصیتیں ایسی دی تھیں جن کا اس جگہ ذکر کرنا شاید بہت سوں کے لیے فائدہ مند اور باعث موعظت ہو جائے۔

قریباً دو تین سال سے انابت الی اللہ اور رغبت فی الآخرۃ کی خاص دولت نصیب ہوگئی تھی، نفل نماز، نفل روزوں اور تلاوت قرآن کی قابل رشک کثرت کے علاوہ غربا و فقراء اور مساکین و یتامیٰ کی خدمت و اعانت ان کا خاص شغل تھا اور یہ خدمت بھی عموماً اخفا کے ساتھ ہوتی، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی غریب کی تکلیف یا کسی خاص ضرورت کا علم ہو جاتا تو اس کی ضرورت کی چیز بازار سے لاکر یا اگر گھر پہ موجود ہوتی تو گھر سے لے جاکر خود ہی ان کے یہاں پہونچا آتے اور اس قسم کے کام عموماً رات کی تاریکی میں کرتے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ عین کھانے کے وقت کوئی حاجتمند آجاتا یا معلوم ہوتا کہ مسجد میں کوئی مسافر آگیا ہے اور اس کو کھانے کی ضرورت ہے تو اپنا کھانا اس کو دے دیتے اور اگر گھر میں کھانا فاضل نہ ہوتا تو خود وہ وقت یوں ہی گزار دیتے، اور گھر والوں پر دوبارہ پکانے کا بار کبھی نہ ڈالتے، محلہ کی مسجد میں ٹھہرنے والے مسافروں کے لیے صبح کو چائے تیار کرکے خود لے جاتے اور پلاتے —— چونکہ سینہ کے ہمیشہ سے کمزور تھے اور سانس یا کھانسی کی تکلیف اکثر ہو جایا کرتی تھی اس لیے موسم سرما میں صبح کو دواءً ایک انڈا تیار کراکے اکثر کھاتے لیکن ایک یتیم کو (جو اپنے گھر ہی رکھ لیا تھا) اس میں بھی ضرور شریک کر لیتے۔ حالانکہ خود اپنے بچے اللہ کے دیے چار تھے لیکن صبح کے اس ایک انڈے میں صرف اس یتیم ہی کا حصّہ ہوتا۔

پچھلے ہی موسم سرما میں روئی بھری ہوئی نیم آستین صدری پہنے ہوئے تھے ایک غریب سائل آگیا اور اس نے سردی کی شکایت کی اسی وقت اپنے جسم سے صدری اتار کے اس کو دیدی، وہ پہن کر چلا گیا، اگلے دن وہ پھر آیا اور کہنے لگا کہ میرے جسم میں یہ ڈھیلی ہے اس سے جاڑا نہیں جاتا اسی وقت اس کو ساتھ لیکر بازار گئے اور اس کے جسم کے ناپ کی نئی صدری تیار کراکے یا خرید کے اس کو دی اور وہ پرانی صدری جو کل اس سائل کو دی تھی بے تکلف آپ پہن لی۔

ان امور خیر میں اُن کی اس فراخ دستی ہی کو دیکھ کر ان کے قریب ترین عزیزوں تک کا یہ اندازہ تھا کہ اُن کے پاس بہت زیادہ نہ سہی لیکن کچھ معتد بہ سرمایہ ضرور ہے لیکن انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ سب کچھ بس یہی تھا جو ان راہوں میں خرچ ہو رہا تھا —— باقی اللہ کا نام!

گذشتہ ہی سال حج کیا اور وہ بھی بڑے نرالے طریقہ سے —— پہلے سے اپنا عزم بلکہ شاید خیال بھی نہ تھا،

البتہ میرے ماموں صاحب حج کی تیاری کر رہے تھے جب ان کی روانگی کا خاص دن آگیا بلکہ جب اسباب بندھ بندھا کر تیار ہو گیا اور روانگی میں کوئی ایک گھنٹہ ہی باقی رہ گیا تو چھوٹے بھائی مولوی محمد احسن سلمہم اللہ تعالیٰ سے کہنے لگے ــــ "بھئی! میرا بھی جی جانے کو چاہتا ہے پھر خدا جانے موقع ملے نہ ملے کہو کیا رائے ہے؟" ــــ انھوں نے کہا ــــ "اس معاملے میں خلاف مشورہ کون دے سکتا ہے، الحمد للہ بڑا مبارک ارادہ ہے لیکن یہ آپ خود سوچ سمجھ لیں کہ آپ کا موقع بھی ہے یا نہیں؟" ــــ بولے: "اس وقت اتنا روپیہ موجود ہے کہ میں جا سکتا ہوں اور انشاء اللہ تین چار مہینے تک گھر کا کام بھی چل سکتا ہے، پھر نہ معلوم کبھی اتنا روپیہ پاس ہوا نہ ہوا۔ اس لیے یہی جی میں آرہا ہے کہ چلا ہی جاؤں، ماموں صاحب کا ساتھ بھی ہے۔ چھوٹے بھائی سے اتنی گفتگو کرنے کے بعد پھر کہا "اچھا تم ابا جی سے اور ذکر کر دیکھو اور ان سے اجازت لے لو، اگر انھوں نے اجازت دیدی تو بس یہی فیصلہ ہے" ــــ وہ اسی وقت والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ــــ "بھائی صاحب حج کا ارادہ کر رہے ہیں آپ سے اجازت چاہتے ہیں" ــــ والد ماجد نے اس ارادہ پر اپنی دلی مسرت کا اظہار فرمایا اور بخوشی اجازت دیدی۔

اب صرف دس پندرہ منٹ میں سفر حج کی تیاری ہوتی ہے، گھر میں آئے اہلیہ سے ذکر کیا، ابتداءً تو انھوں نے ہنسی مذاق سمجھا لیکن جب بتلایا کہ فی الحقیقت یہی ارادہ کر لیا ہے تو انھوں نے کہا اچھا خدا حافظ! کنجی لیکر روپیہ صندوق سے نکالا صرف ایک نیلی فرد اور ایک تہبند، ایک ٹین کا لوٹا گھر میں سے لیا، ایک جوڑا کپڑا جسم پر تھا، بھائی حکیم محمد احسن سلمہ سے کہا ــــ "ایک قمیص اور ایک پائجامہ اپنا اور لا دو اور ایک صدری جس میں کئی جیبیں ہوں" ــــ وہ فوراً تینوں کپڑے نکال کر لائے اُن کا پائجامہ اپنے پائجامے ہی کے اوپر اور قمیص قمیص پر پہن لی اور اوپر سے صدری بھی ڈال لی۔ اور اللہ کا نام لے کر اللہ کے گھر کو روانہ ہو گئے۔

میں بریلی میں تھا اس لیے مجھے بھی تیسرے دن مولوی حکیم محمد احسن سلمہ کے خط سے اطلاع ہوئی، پھر چار پانچ روز کے بعد کراچی سے خود اُن کا معذرتی خط آیا کہ میں نے اچانک ہی ارادہ کر لیا اس لیے ملاقات نہ کر سکا مجھے اور میرے علاوہ اور اعزہ و متعلقین کو بھی اُس وقت حیرت تھی کہ اتنے بڑے کام کا ارادہ اور تہیّا آنًا فانًا کیسے اور کیوں کر لیا گیا لیکن اب اس کی حکمت سمجھ میں آئی کہ مرحوم کی زندگی کا وہ آخری حج تھا اور اس کے بعد اُن کو حج کا وقت ہی آنا مقدر نہ تھا سبحان اللہ و بحمدہ ــــ جب وہ کسی کو اپنے گھر بلانا چاہتے ہیں

تو ایسے بے سان وگمان بلا لیتے ہیں اور جانے والے یوں چلے جاتے ہیں کہ گویا کسی نے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

آخری وقت کی بعض باتیں بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مرض نمونیا اور ڈبل نمونیا تھا یعنی دونوں پھیپھڑے ماؤف تھے، جس وقت بخار بڑھا ہوا ہوتا تو کبھی کبھی ہوش وحواس قائم نہ رہتے، لیکن اس حالت میں بھی خیال نماز وغیرہ ہی کا رہتا بار بار پوچھتے کہ نماز کے وقت میں کتنی دیر ہے؟ کبھی اسی حالت میں مسجد جانے کا ارادہ کرتے اور کہتے کہ "مسجد میں جماعت تیار ہے آپ لوگ مجھے جانے کیوں نہیں دیتے"

تمام ایام مرض میں ہوش اور حاضر حواسی کے اکثر اوقات میں اگرچہ سانس کی شدت مہلت نہ لینے دیتی لیکن کوشش اور مشقت سے کبھی کلمۂ شہادت "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً رسول الله" کبھی استغفار "استغفر الله ربی من کل ذنب واتوب الیہ" ــــ یا ــــ "رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین"، کبھی آیت کریمہ "لا اله الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین"، کبھی دعاء استشفاء "اللهم اشفنی بشفائك وداونی بدوائك واعصمنی من الاحوال والامراض والاوجاع"، اور سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ "یاحی یاقیوم برحمتك استغیث" ــــ الغرض اکثر یہی کلمات طیبات ورد زبان رہتے اور سانس کی شدت کا عالم یہ تھا کہ قریباً ہر ہر کلمہ پر سانس ٹوٹتا ــــ میں نے یہ دیکھ کر کہ اس طرح ان کو تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے کہا کہ اس وقت تم صرف دل ہی دل میں یہ کلمات اور دعائیں پڑھتے رہو، زبان سے ادا کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تو تھوڑی دیر کے لیے زبان روک لی لیکن اس کے بعد پھر اسی طرح پڑھنا شروع کردیا۔

بے ہوشی کے وقت میں بھی اگر کوئی بات ادھر ادھر کی زبان سے نکلتی اور حاضرین میں سے کوئی "اللہ" کا نام پاک لے دیتا تو فوراً زبان پر وہی جاری ہوجاتا، جب تک زبان ساتھ دیتی رہی یہی حال رہا، اور اس کے بعد جب صرف سانس ہی رہ گیا تو اس میں بھی کبھی کبھی "یا اللہ" سنائی دیا، نزع کے وقت گھر والوں، مردوں، عورتوں اور ہوشمند بچوں میں سے غالباً کوئی ایسا نہ تھا جس کی زبان پر مناسب وقت کلمات طیبات نہ ہوں، سب سے زیادہ عبرت انگیز اور سبق آموز حالت ان کی اہلیہ کی تھی، جو میری حقیقی تایا زاد بہن بھی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں سے بڑی صالح فطرت ان کو ملی ہے، بالکل آخری وقت بڑی استقامت کے ساتھ انھوں نے تین مرتبہ کلمۂ

طیبہ کی خود تلقین کی، اور جب روح نے جسم سے مفارقت اختیار کر لی تو خاموشی کے ساتھ اٹھیں، فوراً وضو کر کے ہم سب سے پہلے نمازِ عصر ادا کی جس کا وقت ہو چکا تھا اور دعاء مغفرت میں مشغول ہو گئیں ——— والدہ ماجدہ کی بے قراری دیکھ کر میاں نے عرض کرنے لگا کہ یہی وقت صبر و استقامت کا ہے" لیکن یہ کہتے ہوئے خود میری آواز میں بے اختیار گریہ کا اثر نمایاں ہو گیا، تو اسی وقت بیوہ ہونے والی اور اپنے تاریک مستقبل کو سامنے کھڑا دیکھنے والی میری اس تایا زاد بہن نے مجھ سے کہا "بھائی جی! خدا کے واسطے آپ اپنے کو سنبھالے رکھیں، اگر آپ قابو میں نہ رہے تو پھر ہم سب کا سنبھلنا مشکل ہو جائے گا فی الحقیقت اُن کی اس ایک بات نے اُسوقت مجھے سنبھال لیا ——— میں نے اتنے نازک وقت میں اس صبر و استقامت کا کوئی نمونہ اس سے پہلے نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ اپنی اس بندی کو اس صبر و ثبات کا بہتر اجر، اور دُنیا و آخرت میں راحت و چین دے۔

مرحوم بھائی کی روح نے جس وقت ہم سب کو الوداع کہا شام کے سوا پانچ بجے تھے، نماز عصر سے فراغت کے بعد فوراً ہی تجہیز و تکفین کا انتظام شروع ہو گیا، بعد مغرب غسل دیا گیا اور نماز عشا کے بعد متصلاً نماز جنازہ پڑھ کے قبرستان لے جایا گیا یہاں قبر کی تیاری میں تھوڑی سی دیر تھی، بھائی مولوی حکیم محمد احسن نے مجھ سے کہا اگر ہو سکے تو کچھ بیان کر دیجئے ابھی قبر میں کچھ دیر ہے، اُن کے اس کہنے پر مجھے یاد آیا کہ یہ سنت نبوی بھی ہے۔ صحیح بخاری شریف "کتاب الجنائز" میں ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان ہی یہ ہے" باب الموعظة المحدث عند القبر" جس کے ذیل میں امام بخاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مختصر "وعظ" نقل فرمایا ہے جو آنحضرت نے دفن میت ہی کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا ——— بہرحال طبیعت اگرچہ بہت خستہ اور شکستہ تھی لیکن جب یہ خیال آ گیا تو ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور آیت کریمہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ" تلاوت کر کے تقریباً آدھے گھنٹے "موت" اور" بعد الموت کے متعلق کچھ عرض کیا (جو انشاء اللہ الفرقان کے کسی قریبی شمارہ میں شائع ہو جائے گا) آخر میں توبہ و انابت اور استغفار وطلب رحمت کی ضرورت اور اس کے فضائل و فوائد کا کچھ بیان کر کے، اپنے لئے مرحوم بھائی کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے استغفار ہی پر اس سلسلہ کو ختم کیا گیا ——— اور قریباً دس بجے شب کے مرحوم کو آغوش لحد کے سپرد کر دیا گیا، رحمه الله تعالىٰ رحمةً واسعةً

اور یہ ہم سب کو بھی اسی راہ سے گزرنا اور اسی جگہ پہنچنا ہے، اور بقا ہے صرف اللہ ذو الجلال والاکرام کو۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝

یہ لیجیے
یا یہ!
تازہ پھلوں کے رس اور جسم کو تازگی پہنچانے والی مقوی جڑی بوٹیوں سے مرکب شربت روح افزا، پیتے ہی فوراً تسکین پہنچاتا ہے اور گرمی سے پیدا ہونے والی تھکن کو دور کرتا ہے۔
شربت
روح افزا پیجیے
گرمی کے مقابلے کے لیے ایک ہی شربت
ہمدرد

محمد منظور نعمانی

پہلی رفیقہ حیات کی مفارقت پر

(شمارہ رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ سے)

گزشتہ ذیقعدہ ہی میں چھوٹے بھائی حاجی محمود حسین مرحوم کی رحلت واقع ہوئی تھی اور اب ساتویں رمضان کو میری اہلیہ اسی عالم کی طرف منتقل کر دی گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۝

یہ تقریباً ۱۸ سال سے میری زندگی کی شریک تھیں اور اللہ پاک کا احسان ہے کہ "دنیا" سے زیادہ وہ دین میں میری رفیقہ تھیں۔ اُن کی صابرانہ سیرت کے ساتھ سلیقہ داری و دانشمندی نے مل کر خانگی افکار سے مجھے آزاد کر دیا تھا ——— قریباً دائمی خرابی صحت کے باوجود میری اور بچوں کی خدمت اور گھر کے سارے کام کاج کے ساتھ ان کی کثرتِ عبادت، فرطِ خشیت اور بالخصوص رات کی اور صبح کی نماز میں دعاؤں یا سجدوں میں کبھی کبھی اللہ کے حضور میں ان کا رونا میرے لیے تازیانۂ عبرت بن جاتا تھا۔

ہاتھ اتنا وسیع تھا کہ دروازوں پہ عام طور سے پھرنے والے سائلوں کو دینے کے خلاف میری سخت رائے معلوم ہونے کے باوجود ان کا جی یہی چاہتا کہ کسی کو خالی نہ واپس کیا جائے۔ دل اتنا درد آشنا تھا کہ کسی مصیبت زدہ کو تکلیف یا خستگی کی حالت میں دیکھ لیتیں تو دن بھر بلکہ کبھی کبھی کئی کئی دن اس سے متاثر اور دردمند رہتیں اور بار بار اس کا ذکر کرتیں۔

عام مہمانوں کے متعلق (اپنے خاص حالات کی وجہ سے) میرا اصول یہ ہے کہ وقت پر جو کچھ حاضر ہو وہی ان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے اور کوئی خاص اہتمام نہ کیا جائے، لیکن ان کی خواہش ہمیشہ یہ ہوتی کہ کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور ہو اور وہ اکثر و بیشتر ایسا ہی کرتیں اگرچہ اکثر اوقات سب کچھ

اپنے ہی ہاتھ سے کرنا پڑتا ——— لیکن اپنی ذات کے بارے میں حال یہ تھا کہ مجھے یاد نہیں کبھی انھوں نے زیور یا کسی قیمتی کپڑے ہی کی فرمائش سے مجھ پر بار ڈالا ہو۔ طبیعت ہی اللہ نے سادگی پسند بنائی تھی مگر اس کے ساتھ ہی مزاج میں متین شگفتگی تھی اور نظافت بلکہ گھر تک کی صفائی ستھرائی کا اہتمام تھا کہ ہر روز صبح کو تلاوت کلام پاک وغیرہ معمولات سے فارغ ہونے کے بعد قریباً ایک گھنٹہ روزانہ وہ گھر کی صفائی اور جھاڑ پونچھ میں مزدود صرف کرتی تھیں۔ طرح طرح کی بیماریوں سے زار نزار ہونے کے باوجود جفاکشی اور مستعدی کا عالم یہ تھا کہ بوقت ضرورت بے تکلف خود چکی چلالیتیں جو ان کی خرابی صحت کی وجہ سے کبھی کبھی مجھے ناگوار بھی ہوتا۔ ان کی انہی عادات وخصوصیات نے میری خانگی زندگی کو بے حد ہلکا اور خوشگوار بنا رکھا تھا۔

اُن کے انتقال سے متعلق بعض باتیں بھی قابل ذکر ہیں شاید اللہ کے کسی بندے یا بندی کو اُن سے کوئی سبق حاصل ہو جائے صرف اسی لیے ان کو حوالہ قلم کرتا ہوں۔

(۱) اسی سال شروع اپریل سے آخر جون تک پورے تین مہینے وہ بیمار رہیں اور ابتدائی پندرہ بیس دن کے بعد ہی مرض نے "حمّی لازم" کی صورت اختیار کرلی تھی جس سے مجھے اور ان کے معالجوں کو بھی خطرہ ہو گیا، مرحومہ نے اس بیماری میں مجھ سے کہا کہ "غالباً اس بیماری سے میں بچ نہ سکوں گی" ——— میں نے کہا کیوں؟ ——— کہا "میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس سے میں یہی سمجھی ہوں کہ میرا وقت قریب ہے" میں نے ان کے دل پر سے اس اثر کے دفع کرنے کے لیے کہا کہ "خواب واب کچھ نہیں، تمھارا وہم اور وسوسہ ہے" ——— اس وقت تو میں نے یہی کہہ دیا لیکن چونکہ بعض اعزا کی موت کے متعلق ان کے خوابوں کی صحت کا پہلے سے بھی تجربہ تھا اس لیے خود میں بھی "وہم" میں پڑ گیا ——— مگر میں دیکھتا تھا کہ اب جب کہ ان کو یہ خیال ہے کہ یہی مرض شاید میرا آخری مرض ہو تو پھر ایسی حالت میں رجوع الی اللہ واعراض عن الدنیا کی جو کیفیت ہو جانی چاہیے اور جس طرح ہمہ تن موت کی تیاری میں لگ جانا چاہیے وہ حالت ان کی نہیں ہے، بلکہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بچوں وغیرہ کے خیال سے موت سے کچھ گھبراتی ہیں، میں نے ان کی اس کیفیت کو بار بار محسوس کیا اور دور دور کے اشاروں کنایوں سے ان کو متنبہ کرنا بھی چاہا مگر ان کو تنبہ نہیں ہوا، اور میں نے بیماری کی اس حالت

میں صاف صاف کہنا مناسب نہ سمجھا، لیکن مجھے اس کی بے حد فکر رہی اور میں نے ارادہ کر لیا کہ کسی مناسب وقت پر انشاء اللہ میاں ان کو اس کی طرف مزید توجہ دلاؤں گا۔ اللہ کی شان! کہ اُس بیماری سے ان کو شفا ہو گئی اور پھر میں بھی اپنی اس بات کو بھول گیا، اب رمضان مبارک سے چند روز پہلے میں خود بیمار ہوا تو ایک دن مجھے وہ بات یاد آئی اور میں نے ان سے کہا کہ تمہاری بیماری کے زمانہ میں میں نے یہ کمی تمہاری حالت میں محسوس کی تھی۔ آدمی جب بیمار پڑے اور ایسا بیمار کہ موت بظاہر قریب معلوم ہو تو پھر اس کو چاہیے کہ وہ پورے اطمینان کے ساتھ اللہ پاک کی طرف ہی متوجہ ہو جائے اور تمہارے لیے تو ویسے بھی موت سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے عورتوں کو سب سے زیادہ خیال اپنے بچوں کی "بربادی" کا ہوتا ہے سو تمہارے دونوں بچے تمہاری تربیت کی عمر سے نکل چکے ہیں۔ کتنی ہی اللہ کی بندیاں ہوتی ہیں جو اپنے شیر خوار بچوں کو چھوڑ جاتی ہیں آخر اللہ پاک ان کی بھی پرورش کا سامان کرتا ہی ہے"۔—
میری یہ بات سُن کر ان پر بڑا اثر ہوا اور اپنی اُس حالت پر انھیں بڑا قلق ہوا اور مجھ سے کہا کہ آپ کو یہ بات اُسی وقت مجھ سے صاف صاف کہہ دینی چاہیے تھی، اگر میں اسی حالت میں مر جاتی تو کیا ہوتا؟——

یہ ساری گفتگو محض اتفاقی طور پر ہوئی نہ کہنے والے کو وہم و گمان تھا اور نہ سننے والی کو کہ ابھی ہفتہ عشرہ ہی باہیں "وہ وقت" آجانے والا ہے۔ مگر الحمد للہ کہ دوسری رمضان کو جو اچانک وہ سخت بیمار ہوئیں تو وہ پہلی حالت اب نہ تھی۔ بلکہ ایک عیادت کرنے والی خاتون سے میری اس گفتگو کا حوالہ دے کر انھوں نے اپنا قلبی اطمینان ظاہر کیا۔ اور ان کے سامنے میری وہ ساری تقریر دہرائی۔ (اللهم لك الحمد)

---

(۲) جمعرات کا پہلا روزہ رکھ کر جمعہ کی شب میں وہ غالباً مجھ سے پہلے اٹھیں بڑے اطمینان سے تہجد اور دوسرے معمولات سے فارغ ہو کر سحری تیار کی (شب جمعہ میں زیادہ سویرے اٹھنے اور زیادہ پڑھنے پڑھانے کی وہ ہمیشہ کی حریص تھیں) اور کھا پی کر ہم سب تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ جماعت کا وقت آنے پر میں مسجد چلا گیا۔ قریب آٹھ بجے کے جب وہاں سے واپس آیا تو دیکھا کہ حسب عادت قرآن پاک کی تلاوت کر رہی ہیں، لیکن چہرہ کی حالت اور بار بار پہلو بدلنے سے مجھے شبہ ہوا کہ شاید کوئی

تکلیف ہے، میں نے دریافت کیا کہ خیریت تو ہے؟ جواب دیا کہ "کچھ جی خراب سا ہو رہا ہے اور پیٹ میں درد بھی ہے" میں نے کہا کہ پھر تلاوت شام کو کر لینا! — کہا سورۂ کہف شروع کر چکی ہوں اب تو اس کو ختم ہی کروں گی (کہف ان کو حفظ بھی تھی اور جمعہ کو اس کے پڑھنے کا التزامی معمول تھا) بہرکیف اسی حالت میں انھوں نے کہف ختم کی اور فوراً ہی قے اور درد میں شدت شروع ہو گئی۔

(۳) پانچ دن وہ مریض رہیں ابتدائی دو دن اور آخر کے ایک دن تکلیف اتنی شدید رہی کہ نمازیں لیٹے لیٹے اشاروں سے پڑھیں تکلیف کی شدت اور طبیعت کے ضعف کو دیکھ کر میں نے ایک روز کہا کہ جس وقت تکلیف زیادہ ہوا کرے تو نماز کو زیادہ مختصر کر دیا کرو مثلاً رکوع، سجدہ کی ایک ہی تسبیح پر اکتفا کر لیا کرو، چنانچہ اس کے بعد سے انھوں نے اسی پر عمل کیا، لیکن آخری دن عصر کی نماز جب انھوں نے پڑھی تو اگرچہ آج تکلیف اور ضعف کی ہر دن سے زیادتی تھی لیکن وہ دیر لگا کر پڑھی اور بعد نماز بہت دیر تک دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کرتی رہیں جس میں بار بار اپنے گناہوں سے استغفار کرتی تھیں۔ میرے علم میں یہی ان کی آخری نماز تھی، مغرب اور عشا کے وقت میں ان کو نماز کا ہوش نہیں رہا اور اسی رات کو ۹ بجے ان کا وقت موعود آ گیا۔ للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شئی عندہ اجل مسمّی فلنصبر و لنحتسب ——

دفتر "الفرقان" کے قریب جو مسجد واقع ہے جس میں نماز پڑھتا ہوں اور جو اس عاجز ہی کی تحریک سے گزشتہ سال ہی از سرِ نو تعمیر ہوئی ہے، خاص اس کی فصیل کے نیچے مرحومہ دفن کی گئیں۔ — بظاہر تو امیدِ رحمت کی بہت سی وجوہ جمع ہیں، رمضان مبارک کا مہینہ، مرض تخمہ جس کی موت کو حدیث میں شہادت قرار دیا گیا ہے۔ پھر مسافرت کی حالت اور زیرِ مسجد تدفین، جہاں ہر وقت اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔

اے اللہ ان نیک فالوں کو حقیقت بنا دے اور اپنی اس عاجز بندی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، حسنات قبول فرما، اور سیئات سے درگزر۔ مغفرت و رحمت تیری شان ہے اور تیرے گنہگار بندوں کو تجھ سے اسی کی امید ہے۔ انک انت الغفور الرحیم ط

اپنے ناظرین کرام اور جملہ اخوان دینی سے بھی انہی دعاؤں کی استدعا ہے۔

محمد منظور نعمانی

اللہ کے لیے جینے اور مرنے والا ایک بندہ

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ

(رجب ۱۳۶۳ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

واقعہ یہ ہے: گذشتہ سال رجب و شعبان ہی کے مشترکہ پرچے میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے راقم الحروف کے قلم سے آخر میں یہ چند سطریں نکلی تھیں۔

"برادران دینی! جانے والے جا چکے اور جو ابھی باقی ہیں وہ بھی ایک دن اسی طرح چلے جائیں گے اور یہ قریباً کلیہ سا ہو گیا ہے کہ جو جاتا ہے اس کی جگہ عموماً خالی ہی رہتی ہے —— اس لیے جو بندگان خدا اس وقت موجود ہیں، جن کی صحبت، اللہ کی خشیت اور ایمانی حلاوت پیدا کرنے میں خاص اثر رکھتی ہے اور جن کی نشانی حدیث نبوی میں یہ بتلائی گئی ہے کہ:۔

یذکرکم اللہ رؤیتہ ویذکرکم	ان کا دیکھنا تمہارے اندر اللہ کی یاد کو تازہ کر دے
الآخرۃ عملہ وینفعکم منطقہ	اور ان کے اعمال کا مطالعہ تمہیں آخرت کی یاد دلائے
	اور ان کی گفتار سے تم کو نفع حاصل ہو۔

بہرحال ایسے جو بندگان خدا اس وقت موجود ہیں (اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے تاہم اللہ کی زمین ابھی ایسے وجودوں سے خالی نہیں ہوئی ہے) تو چاہیے کہ ان ہستیوں کو غنیمت بلکہ اللہ کی نعمت سمجھا جائے اور ان کی صحبت سے حسب توفیق فائدہ اٹھایا جائے کیا خبر کل کو ان میں سے بھی کون نہ رہے۔

آج تو پی لو خدا جانے کہ کل کیا حشر ہو   میکدہ اٹھ جائے یا پیر مغاں ساقی نہ ہو

ان سطروں میں میں نے نام تو اگرچہ اپنے کسی بزرگ کا بھی نہیں لیا تھا لیکن جن دو تین خاص ہستیوں کی طرف میرا اشارہ تھا ان میں افادی وارشادی خصوصیات اور نافعیتِ صحبت کے لحاظ سے میرے نزدیک

اہم ترین ہستی حضرت مولانا الیاس (علیہم الرحمۃ والرضوان) کی تھی اور اس مضمون ہی کی طرف میں نے ایک چھپا ہوا اشارہ بھی اس طرح کر دیا تھا کہ اسی شمارہ میں حضرت حکیم الامت کے اس تذکرہ کے بعد متصلاً ہی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب علیہ الرحمۃ کے بیس اصلاحی ملفوظات کی ایک قسط شائع کی تھی ـــــ بہت سے سمجھنے والوں نے میرے اس اشارہ کو سمجھ بھی لیا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ میں نے یہ لکھا تھا بغیر کسی خاص خطرہ کے شعور و احساس کے محض اتفاقی طور پر قلم سے نکل گیا تھا، مجھ انجان کو کیا خبر تھی کہ حضرت مولانا کے انفاس طیبہ سے ہماری محرومی بھی اسی سال میں مقدر ہو چکی ہے اور آنے والے رجب ہی میں وہ بھی ہم میں سے اٹھا لیے جائیں گے۔ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم ۝

حضرت مولانا کے وصال سے بظاہر تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ کروڑوں مسلمانوں میں سے ایک مسلمان یا ہزاروں عالموں اور بزرگوں میں سے ایک بزرگ عالم اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور یہ سب کچھ اس دنیا میں روز ہی ہوتا رہتا ہے ـــــ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس دنیا میں اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا اکیلا وجود لاکھوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور وہ پتھروں کی کان میں لعل اور ہیرا ہوتے ہیں، بیشک حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی رجال عظام میں سے تھے اور ایسوں کی موت و حیات روحانی دنیا میں بہت بڑا تغیر اور انقلاب عظیم ہے ـــــ آہ! جنھوں نے نہیں جانا ان کو کس طرح بتایا جائے اور کیسے باور کرایا جائے کہ کتنی بڑی چیز کھو گئی ہے

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدے
ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

افسوس! بہت ہی کم لوگوں نے حضرت مولانا کو جانا اور ان کی دینی دعوت کی اہمیت کو سمجھا حتی کہ علماء کے جس مخصوص طبقے کو زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونا چاہیے تھا اس کی اکثریت نے بے توجہی اور بے اعتنائی کی .... پھر بہتوں نے توجہ بھی کی تو صرف اتنا سمجھ کر کہ مولانا ایک مخلص بزرگ ہیں اور مسلمانوں میں کلمہ اور نماز کی تبلیغ کرنا اور کرانا چاہتے ہیں بہرحال نیک کام ہے اس لیے ساتھ دینا چاہیے ـــــ لیکن مولانا جو کچھ تھے اور جس کام کے لیے ان کی دعوت و پکار تھی جیسا کہ عرض کیا گیا اس کو بہت ہی کم لوگوں نے سمجھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے قریباً ڈیڑھ دو مہینے پہلے اس کمی کا احساس بہت زیادہ

ہونے لگا تھا اور جی چاہتا تھا کہ کاش خاص صلاحیتوں والے اہلِ علم مولانا کے یہاں زیادہ آئیں مگر دلوں پر اللہ کے سوا اختیار کسے ہے!

ایک دن کا واقعہ ہے یہ عاجز راقم سطور اور اخی فی اللہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (کثر اللہ امثالہم) کسی کام سے بستی نظام الدین سے دہلی شہر آئے یہاں حضرات اہلِ علم کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی ایک مناسب تمہید کے بعد ہم دونوں نے اُن حضرات کو حضرت مولاناؒ اور ان کے کام و پیغام کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور عرض کیا کہ مولانا کی برکات سے استفادہ اور ان کے کام کو سمجھنے اور دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ وقت اور روپیہ صرف کر کے دور دراز سے مستقل سفر کر کے آتے ہیں، اپنے کاموں کا حرج کر کے آتے ہیں اور ہفتوں پڑے رہتے ہیں۔ خود ہم کو بھی مستقل ہی سفر کر کے آنا پڑتا ہے۔ آپ کو اللہ پاک نے بہت ہی اچھا موقع دیا ہے، آپ حضرات دہلی ہی میں رہتے ہیں کبھی کبھی وقت نکال کر بستی نظام الدین تشریف لے جایا کیجیے، یہ بھی عرض کر دیا کہ حضرت کی موجودہ علالت تشویشناک ہے بہت ممکن ہے کہ پھر ہم اس ہستی سے محروم ہو جائیں۔

پوری دلسوزی کے ساتھ یہ عرض کرنے کے بعد بھی جب یہی محسوس ہوا کہ ان حضرات نے اس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی، — تو ہم کو تاسف اور قلق ہوا اور میں تعجب و حیرت کا اظہار کرنے لگا کہ یہ حضرات اتنی بڑی چیز سے کتنے بے پروا اور اپنے عمومی مشاغل پر کیسے قانع اور ان میں کتنے منہمک ہیں، تو رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا — تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، اسی دلّی میں جب حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیزؒ، اور شاہ اسمٰعیل شہید تھے تب بھی خود دلّی میں رہنے والوں کو اس کی فرصت بہت کم ملتی تھی کہ وہ ان کی برکات سے استفادہ کریں۔ اور اُن کے پیغام کو سُنیں!

اسی طرح کے تجربات و احساسات نے یہ خیال پیدا کیا تھا کہ حضرت مولانا کی ایک مختصر سی ہی سوانح حیات اور ان کی دعوت و تحریک کے متعلق ملفوظات مرتب کر کے جس قدر جلد ممکن ہو شائع کر دی جائے۔ سوانح کی ترتیب رفیق محترم نے اپنے ذمہ لی تھی اور اس کا کچھ کام انھوں نے شروع بھی کر دیا تھا، اور ملفوظات کا کام میں نے شروع کیا تھا۔ اگرچہ ارادہ اور آرزو یہی تھی کہ یہ مجموعہ حضرت کی حیات ہی میں شائع ہو جائے تاکہ اس کے ذریعہ واقف ہو کر ہی لوگ ادھر متوجہ ہوں، لیکن مقدر یہی تھا کہ اس کی

تکمیل حضرت کے وصال کے بعد ہو، دونوں کام ابھی بالکل ابتدائی درجہ ہی میں تھے کہ حضرتؒ کا وقت موعود آگیا —— یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید

اب تجویز یہ ہے کہ الفرقان کی ایک غیر معمولی اشاعت اس تذکارِ حسن کے لیے مخصوص کر دی جائے۔ اُمید یہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ سالِ رواں کے اندر ہی "الفرقان" کا وہ خاص نمبر ہدیۂ ناظرین کرام ہو سکے گا۔ آپ حضرات بھی دعاؤں سے ضرور مدد فرمائیں۔

حضرت کی اس آخری علالت ہی کی دو چار باتیں اس صحبت میں بھی ذکر کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔

(۱) اپریل کے آخری ہفتے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری زیارت اور مزاج پُرسی کے لیے تشریف لائے، اس سے دو دن پہلے حضرت پر نہایت سخت دورہ پڑ چکا تھا جس کی وجہ سے ضعف بے حد ہو گیا تھا کہ دو چار منٹ بھی بات کرنے کی سکت نہ تھی۔ شاہ صاحب کی خبر سن کر اس ناچیز کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا مجھے ان سے باتیں ضروری کرنی ہیں، لیکن صورت یہ ہوگی کہ تم اپنے کان میرے منھ کے قریب کر دینا اور میں جو کہوں وہ اُن سے کہتے جانا —— چنانچہ جب شاہ صاحب اندر بلائے گئے تو بات شروع تو میرے ہی واسطے سے فرمائی۔ لیکن دو تین ہی منٹ کے بعد اتنی قوت آگئی کہ خود مخاطب ہو گئے اور قریباً آدھ گھنٹہ مسلسل تقریر فرماتے رہے۔ اس تقریر کے دوران میں ارشاد فرمایا۔

"شاہ صاحب! میں نے شروع میں مدرسہ پڑھایا (یعنی مدرسہ میں درس دیا) تو طلبہ کا ہجوم ہوا اور اچھے اچھے صاحبِ استعداد طلبہ کثرت سے آنے لگے —— میں نے سوچا کہ ان کے ساتھ میری محنت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ جو لوگ عالم، مولوی بننے کے لیے ہی مدرسہ میں آتے ہیں مجھ سے پڑھنے کے بعد بھی وہ عالم، مولوی ہی بن جائیں گے اور پھر ان کے مشاغل وہی ہوں گے جو آجکل عام طور سے اختیار کیے جاتے ہیں کوئی طب پڑھ کر مطب کرے گا، کوئی یونیورسٹی کا امتحان دے کر اسکول کالج میں نوکری کرے گا، کوئی مدرسہ میں بیٹھ کر پڑھاتا ہی رہے گا، اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر مدرسہ میں پڑھانے سے میرا دل ہٹ گیا۔ اس کے بعد ایک وقت آیا جبکہ میرے حضرت نے مجھ کو اجازت دے دی تھی تو میں نے طالبین کو ذکر کی تلقین شروع کی اور ادھر میری توجہ زیادہ ہوئی، اللہ کا کرنا آنے والوں پر اتنی جلدی

کیفیات اور احوال کا ورود شروع ہوا اور اتنی تیزی کے ساتھ حالات میں ترقی ہوئی کہ خود مجھے حیرت ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور اس کام میں لگے رہنے کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ —— زیادہ سے زیادہ یہی کہ کچھ اصحاب احوال اور ذاکر شاغل لوگ پیدا ہو جائیں پھر لوگوں میں اگر ان کی شہرت ہو جائے تو کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کے لیے آئے، کوئی اولاد کے لیے تعویذ کی درخواست کرے کوئی تجارت اور کاروبار میں ترقی کی دعا کرائے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے ذریعہ بھی آگے کو چند طالبین میں ذکر و تلقین کا سلسلہ چلے —— یہ سوچ کر ادھر سے بھی میری توجہ ہٹ گئی اور میں نے یہ طے کیا کہ اللہ نے ظاہر و باطن کی جو قوتیں بخشی ہیں ان کا صحیح مصرف صرف یہ ہے کہ ان کو اسی کام میں لگایا جائے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوتیں صرف فرمائیں، اور وہ کام ہے "اللہ کے بندوں کو اور خاص طور سے غافلوں بے طلبوں کو اللہ کی طرف لانا اور اللہ کی باتوں کو فروغ دینے کے لیے جان کو بے قیمت کرنے کا رواج دینا" بس ہماری یہ تحریک یہی ہے اور یہی ہم سب سے کہتے ہیں یہ کام اگر ہونے لگے تو اب سے ہزاروں گنے زیادہ مدرسے اور ہزاروں گنی زیادہ خانقاہیں قائم ہو جائیں بلکہ ہر مسلمان مجسم مدرسہ اور خانقاہ ہو جائے اور حضور کی لائی ہوئی نعمت اس عمومی انداز میں بٹنے لگے جو اس کے شایانِ شان ہے۔"

اس صحبت میں حضرتؒ نے اس کے علاوہ جو کچھ اور فرمایا تھا وہ انشاء اللہ تعالیٰ ملفوظات کے سلسلے میں ہدیۂ ناظرین ہوگا یہاں تو اس سلسلۂ کلام کا صرف اتنا ہی ٹکڑا درج کرنا تھا۔

(۲) اسی اپریل کے مہینے میں جس روز آپ پر وہ شدید دورہ پڑا جس کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے۔ اُس دن آپ پر قریب دو گھنٹے کے غشی کی سی کیفیت طاری رہی، آنکھیں تک بند تھیں، دیر کے بعد یکایک آنکھیں کھولیں اور زبان پر یہ کلمات جاری ہوئے۔

الحق یعلو، الحق یعلو، الحق یعلو، ولا یعلیٰ

پھر ایک وجد کی سی کیفیت میں ایک گونہ ترنم کے ساتھ (جو عام عادت نہ تھی) تین دفعہ یہ آیت تلاوت فرمائی۔ کان حقًا علینا نصرُ المومنین ۞ (ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے ذمہ حق ہے) جس وقت بلند آواز سے آپ نے یہ آیت تلاوت فرمانی شروع کی میں صحنِ مسجد میں تھا آواز سُن کر حضرت کے حجرہ کے دروازہ پر جا کھڑا ہوا، جو خاص خادم اندر تھے اُن سے میرا نام لے کر ارشاد فرمایا کہ وہ کہاں ہے؟ میں سنتے ہی اندر حاضر ہو گیا، ارشاد فرمایا

"مولوی صاحب! اللہ کا وعدہ ہے کہ یہ کام ہوگا اور اللہ کی مدد اس کو اتمام تک پہنچائے گی۔ مگر یہ شرط ہے کہ اس کے اس وعدۂ نصرت پر کامل یقین اور بھروسہ کے ساتھ اس سے نصرت کو مانگتے رہو اور اپنی امکانی کوششوں میں کمی نہ کرو۔"

یہ فرمانے کے بعد پھر آنکھیں بند ہوگئیں، تھوڑی دیر کی گہری خاموشی کے بعد صرف اتنا فرمایا۔

"کاش علماء اس کام کو سنبھال لیتے اور پھر ہم چلے جاتے۔"

(۳) عجیب تماشا تھا اس علالت میں حضرتؒ کی قوت و صحت جوں جوں گرتی تھی، احیاءِ دین کی تڑپ اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جذبہ روز بروز اسی قدر بڑھتا جاتا تھا۔ ضعف و نقاہت کے لحاظ سے حضرتؒ کی مہینوں وہی حالت رہی جس حالت میں اچھوں اچھوں کو بھی سوائے خاموش پڑے رہنے کے اور کچھ گوارا نہیں ہوتا ہے لیکن اس سارے عرصہ میں دیکھنے والوں نے اکثر ان کو تین ہی حالتوں میں دیکھا۔

یا اسؒ کام (احیاءِ دین) کی سوچ و فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں، اسؒ کے لیے دل کی انتہائی شکستگی کے ساتھ دعائیں فرما رہے ہیں۔ کارکنوں کے لیے اخلاص، ثبات و استقامت، اتباع طریقۂ محمدی اور اصول مرضیہ کی پابندی اور پھر رضاء و قبول اپنے اللہ سے مانگ رہے ہیں اور ایسے سوز کے ساتھ مانگ رہے ہیں کہ بعض اوقات پاس والوں کو رونا آجاتا ہے، یا اسؒ سلسلہ میں احکام و ہدایت دے رہے ہیں، بس ہر وقت کا گویا یہی شغل تھا۔ ہر آنکھوں والا دیکھ سکتا تھا کہ اللہ کے لیے جینے اور مرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

حتیٰ کہ علاج کے سلسلہ میں بھی جو طبیب یا ڈاکٹر آتے اُن سے پہلے اپنی بات کہتے اس کے بعد ان کو دیکھ بھال کا موقع دیتے —— ایک دن حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دلّی کے ایک مشہور مسلمان ڈاکٹر کو لائے۔ مولاناؒ نے اپنی بات ان سے کیسے عجیب انداز میں کہی فرمایا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس ایک فن ہے جس سے مخلوق استفادہ کرتی ہے لیکن وہ فن وہ ہے جس کو ماند کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام چند ظاہری معجزے (اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دینا، مردوں کو زندہ کر دینا) دے کر بھیجے گئے تھے، اور یہ تو آپ جان سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو روحانی علوم دیے گئے تھے وہ ان ظاہری معجزوں سے بدرجہا اعلیٰ اور افضل تھے، تو مجھے آپ سے یہ کہنا

ہے کہ ہمارے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو روحانی علوم اور احکام بھیجے گئے ہیں وہ وہ ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روحانی علوم اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو بھی غیر چلن دار کردیا تو ذرا سوچئے کہ حضور کی لائی ہوئی ان روحانی چیزوں کی طرف توجہ نہ کرنا کتنی بڑی چیز کی ناقدری ہے۔

(۴) اس موضوع (احیاءِ دین) کے سوا کوئی بات کہنا تو درکنار سننا تک گوارا نہ تھا، اگر کوئی شخص کوئی دوسری بات سامنے شروع کردیتا تو اکثر اوقات برداشت نہیں فرما سکتے اور فوراً روک دیتے۔ خدام میں سے کوئی خیریتِ مزاج پوچھتا تو فرماتے۔

" کبھی تندرستی بیماری تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اس میں کیا خیریت اور بے خیریت ہے خیریت تو جب ہے کہ جس کام کے لیے پیدا کئے گئے ہیں وہ کام ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک کو چین ہو ——— (فرماتے) ——— صحابہ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حال میں چھوڑا تھا اس میں ادنیٰ تغیر آنے کو بھی وہ خلافِ خیریت سمجھتے تھے "

آہ! اور جب تک کان یہ باتیں سنتے تھے، آنکھیں ان کیفیات وواردات کا نظارہ کرتی تھیں اور دل حسبِ توفیق اثر لیتا تھا۔ آج ان چیزوں کی حسرت کے ساتھ بس یاد ہی باقی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس کو کبھی فنا نہیں ——— کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام ہ

جہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا غم اور صدمہ ہے وہیں طبیعت کو اس سے بڑا اطمینان ہے اور یقیناً اللہ کی اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کو مٹا کے اللہ کے جس کام کو زندہ کیا تھا اور نصرتِ دین و دعوت الی اللہ کے جس فریضہ کی تجدید کی تھی، حضرت کے وصال کے بعد بھی بفضلہ تعالیٰ اس میں کوئی اضمحلال نہیں آیا ہے۔ بلکہ جیسا کہ اپنی اس آخری علالت ہی میں کئی بار اپنے فکر مند نیازمندوں کو مطمئن کرنے کے لیے آپ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد کام میں اور زیادہ ترقی ہوگی اور وہ آئیں گے جو ابھی تک نہیں آتے ہیں، تو آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ بحمد اللہ کام برابر آگے ہی بڑھ رہا ہے اور اس وقت جبکہ یہ سطور سپردِ قلم کی جارہی ہیں حالانکہ رمضانِ مبارک کا مہینہ ہے مگر اتنی جماعتیں اور اتنے قافلے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے گھروں کی راحتوں کو چھوڑے ہوئے روزوں کی حالت میں اس دعوتِ دین کے سلسلہ میں مصروفِ گشت ہیں کہ اس سے پہلے اس کام کی پوری تاریخ میں کبھی اتنا بلکہ شاید اس کا آدھا بھی نہیں ہوا تھا فللہ الحمد ولہ المنۃ
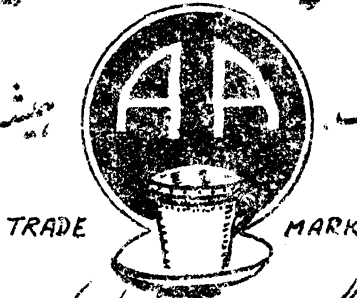
محمد منظور نعمانی

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ

اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ

(رمضان مبارک ۱۳۶۶ھ اگست ۱۹۴۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

والد ماجد[1] نے اسی رمضان مبارک کی پانچویں شب میں عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کے اور تراویح بھی بیس رکعت ادا کر کے ایسے انداز سے آخرت کا سفر فرمایا جو بظاہر اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا کوئی خاص ظہور تھا۔ والغیب عند اللہ تعالیٰ۔

واقعہ رحلت کی تفصیل سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کی زندگی کی بعض قابل ذکر اور سبق آموز خصوصیات کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ امید ہے کہ اللہ کے بندوں کو اس تذکرہ سے انشاء اللہ نفع ہوگا۔

نماز اور جماعت کا اہتمام

نماز با جماعت کا جیسا اہتمام میں نے اپنے والد ماجد میں دیکھا، ایسا بہت ہی خاص بندگان خدا میں دیکھا ہے۔ اور یہ صرف اپنے ہی حق میں نہ تھا، بلکہ اُن کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ گھر کا ایک ایک آدمی، بلکہ ہر صاحب شعور بچہ بھی جماعت کے وقت مسجد میں پہونچ چکا ہو۔ نماز کا وقت شروع ہوتے ہی سب پر تقاضا فرمانا شروع کر دیتے تھے۔ پھر جب مسجد کو جاتے تو راستہ کے لوگوں کو یاد دلاتے جاتے، ادھر چند مہینے سے آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا اور بینائی تقریباً معدوم ہوگئی تھی جس کی وجہ سے خود وقت کا اندازہ نہ فرما سکتے تھے تو ظہر اور عصر میں بہت پہلے سے دریافت فرمانا شروع کر دیتے تھے کہ بتلاؤ دروازہ کے سامنے سایہ

---

[1] والد ماجد کا اسم گرامی احمد حسین تھا، لیکن عام طور سے "صوفی احمد حسین" کے نام سے معروف و مشہور تھے ۱۲۔

کہاں تک پہونچ گیا؟ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دس دس دفعہ دریافت فرماتے اور گھر کے بعض ناسمجھ بچے اس بار بار کی دریافت سے تنگ اور عاجز آجاتے ——— ادھر سال دو سال سے جب کہ جسمانی قوت میں اور اعضاء رئیسہ میں زیادہ ضعف ہو گیا تھا، ہر نماز کے لیے خصوصاً تہجد کے لیے زیادہ سویرے تیاری فرماتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "ہارا ٹٹو سویرا سوار ہی"[1]

نوافل کا اہتمام نوافل میں اشراق، اوابین، اور تہجد پابندی سے پڑھتے تھے۔ کبھی اُن کا تہجد قضا ہوتا میرے علم میں نہیں۔ اب اُن کی رحلت کے بعد میں نے والدہ ماجدہ سے دریافت کیا کہ کبھی ان کا تہجد قضا ہوتا آپ کو یاد ہے؟ فرمایا ہاں کبھی بہت عرصہ پہلے ایسا ہو جاتا تھا لیکن پھر اُس دن روزہ رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس کا یہی علاج ہے۔

ذکر و تسبیح ذکر کے سلسلہ کے اپنے معمولات کبھی انھوں نے تفصیل سے نہیں بتلائے لیکن دن اور رات کے جتنے وقت وہ تسبیح سے شغل رکھتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کے حساب سے ان کے مختلف اذکار و تسبیحات کی مجموعی مقدار دس بارہ ہزار سے یقیناً زیادہ تھی۔ جن میں سے تہجد کے بعد دوازدہ تسبیح، اور عصر و مغرب کے درمیان دو ہزار اسم ذات کے معمول کا مجھے علم ہے، ان کے علاوہ آیت کریمہ اور تسبیح و تحمید اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ اور درود شریف وغیرہ کی تعداد کا مجھے علم نہیں، اتنا معلوم ہے کہ یہ سب چیزیں اُن کے معمولات میں تھیں، اور ان میں سے بعض کی مقدار شاید کئی کئی ہزار تھی۔

ایک زمانہ میں اُن کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد کھڑے ہو کے اور اپنے کو روضۂ مقدسہ نبوی پر تصور کر کے ۴ ہزار بار درود شریف پڑھتے تھے ——— ذکر فرماتے تھے کہ انھیں ایام میں ایک دن پڑھتے پڑھتے ایک خفیف غنودگی سی طاری ہوئی اور ایک ایسی حالت ہو گئی جو نہ نیند تھی اور نہ پوری بیداری، اُسی عالم میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور حضورؐ نے مجھے دو رکابیاں (پلیٹیں) عطا فرمائیں ایک مٹی کی اور ایک چاندی کی ——— فرماتے تھے،

---

[1] ایک حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (من خاف ادلج ومن ادلج بلغ المنزل) جسے منزل کی فکر اور کھٹکا ہوگا وہ اندھیرے منھ سویرا چل دے گا، اور جو سویرا چل دے گا وہ منزل پر پہونچ جائے گا۔

میں نے اُس سے یہ سمجھا ہے کہ مٹی کی رکابی دُنیا ہے اور چاندی کی رکابی دین ہے، اور مجھے یہ دونوں عطا ہوں گی پھر فرمایا کرتے تھے کہ دنیا تو الحمدللہ خوب مل گئی، اللہ تعالیٰ نے گذارہ کا پورا سامان دے رکھا ہے، لیکن دین ابھی نصیب نہیں ہوا، شاید میری اولاد میں کوئی "شام کی اڑان"[1] کا پیدا ہو جائے، اور یہ بشارت اُس کے ذریعہ پوری ہو جائے۔

معمولات میں استقامت اور مداومت

نوافل اور اذکار کے معمولات میں استقامت اور مداومت کی شان یہ تھی کہ تکلیف دہ بیماری کی حالت میں بھی ان کو ترک کرنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ بیماری میں ان کا یہ "نشہ" شاید اور زیادہ تیز ہو جاتا تھا اور چاہتے تھے کہ اس حالت میں اللہ کی یاد اور زیادہ ہو۔ اُن کی عمر بھر کی حسرت تھی کہ زندگی کے آخری دن تک ان کے اذکار اسی طرح جاری رہیں اور موت ذکر ہی کی حالت میں آئے۔ سو بظاہر تو اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری فرما دی، زندگی کی آخری ساعتوں تک اللہ کی یاد اور دعا و استغفار کا سلسلہ جاری رہا۔

میرے دوست مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی (جو آجکل ہمارے صوبہ یوپی کی وزارت تعلیم کے پارلیمنٹری سکریٹری ہیں) کو سفر حج میں والد ماجد کے احوال و اشغال دیکھنے کا کچھ موقع ملا تھا تو حج سے واپسی پر انھوں نے راقم سطور کو لکھا تھا کہ میں نے اُن کے جو حالات اور مشاغل دیکھے ایسے تو مشاہیر اور مشائخ میں بھی کم دیکھنے میں آتے ہیں، عجب جواں ہمت بزرگ ہیں فی الحقیقت ذکر و عبادت اور شب بیداری کے بارہ میں والد ماجد کی ہمت اور عزیمت جوانوں کے لیے بڑی ہی سبق آموز تھی۔

صلۂ رحمی

ان کی زندگی کی ایک قابل ذکر خصوصیت صلۂ رحمی بھی تھی۔ قرابتداروں میں اگر کوئی ضرورت مند ہوتا تو برابر مالی خدمت کرتے، بیمار ہوتا تو خبر گیری کرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خاندان کا کوئی بوڑھا بیمار ہے اور اُس کے گھر والے اُس کی

---

[1] یہ کبوتر بازوں کی خاص اصطلاح ہے، جو کبوتر اتنی لمبی اور اونچی پرواز کا ہو کہ صبح کو اڑان شروع کرے اور دن بھر برابر اڑتا ہی رہے اور شام کو اُترے اُس کو کہتے ہیں کہ یہ شام کی اڑان" کا ہے۔ والد ماجد یہ لفظ بہت بولتے تھے وہ نوجوانی میں کبوتر باز اور کبوتر بازوں کی سوسائٹی میں رہے تھے۔

اچھی خبر گیری نہیں کر رہے ہیں یا اپنے حالات کی وجہ سے مجبور ہیں تو والد ماجد اُن کو اپنے گھر لے آتے۔

سخاوت اور اہل حاجت کی خدمت

فقراء، مساکین اور عام سائلین کو دینے میں اُن کا ہاتھ جتنا کھلا ہوا تھا اور اللہ نے انھیں اس کا جو حوصلہ دیا تھا (اللہ کے مخصوص ترین بندوں کو مستثنیٰ کر کے) کم از کم میں نے اس کا نمونہ آج تک نہیں دیکھا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی سائل آیا اور ہماری نظر میں وہ مستحق نہیں ہے اور ہم نے اپنی یہ رائے ظاہر بھی کر دی لیکن وہ اس کو کبھی کچھ نہ کچھ ضرور دیتے تھے، کسی سائل کو خالی واپس نہ کرنا ان کا اصول تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسے لوگوں کو بھی جن کو ہم مستحق نہیں سمجھتے تھے اتنا دے دیتے تھے کہ ہم پر گراں گزرتا تھا۔ بہرحال اس معاملہ میں اُن کی ہمت کی بلندی اور ہاتھ کی فراخی حیرت انگیز تھی۔ انتقال سے کچھ ہی روز پہلے کا واقعہ ہے کہ اپنے ہی شہر کے ایک دوسرے محلہ کے ایک صاحب آئے اور انھوں نے اپنی حاجت ظاہر کی، والد ماجد نے کسی بچہ سے فرمایا کہ گھر میں ایک روپیہ یا دو روپے کا نوٹ ہو تو لے آؤ۔ بچہ والدہ ماجدہ کے پاس آیا اتفاق سے اُس وقت ایک یا دو روپیہ والا کوئی نوٹ موجود نہ تھا، بچہ نے آکر یہی عرض کر دیا، فرمایا اچھا پانچ روپیہ کا ہو تو لے آؤ۔ اتفاقاً اُس وقت پانچ روپیہ کا بھی کوئی نوٹ موجود نہ تھا، والدہ ماجدہ نے اُس بچہ سے کہدیا کہ پانچ کا بھی نہیں ہے دس کا ہے، بچہ نے آکر یہی عرض کر دیا فرمایا اچھا دس کا ہی لے آؤ، چنانچہ بچہ دس کا نوٹ والدہ ماجدہ سے لے گیا، والد ماجد نے وہی نوٹ اُن صاحب حاجت سائل کو دے دیا، اور گھر میں آکے فرمایا کہ میں تو ایک یا دو روپے ہی دینا چاہتا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے اُس کی قسمت کے دس ہی تھے۔

ہر سال گھر کے خرچ کے اندازہ کے علاوہ صرف فقراء اور مساکین کے لیے غلہ کی ایک مقدار ضرور رہتی تھی، حتیٰ کہ اگر اپنی کاشت کی پیداوار میں اتنی گنجائش نہ ہوتی تو خرید کر رکھا جاتا۔ چنانچہ اس سال بھی ایسا ہی ہوا کہ اپنی کاشت کی پیداوار کم تھی، اس لیے کئی سو روپے کا غلہ باہر سے خریدا، اس کے بعد پھر کئی سو روپے کا اور خریدا تو والدہ ماجدہ نے عرض کیا کہ اس قدر غلہ خریدنے کی کیا ضرورت ہے جو پہلے لیا جا چکا وہی بہت کافی ہے! فرمایا، تم کیا جانو! جب زیادہ

بڑا ہوگا تو حاجتمندوں کو دینے میں ہاتھ نہیں رکے گا۔ چنانچہ خاص قسم کے اُن سائلوں کے علاوہ جو روپے پیسے ہی کے سائل ہوتے ہیں اکثر اہل حاجت کو وہ غلہ ہی دلواتے تھے اور جس کو بھوکا سمجھتے تو حتی الامکان اس کو پکا پکایا کھانا کھلاتے تھے۔ جس زمانہ میں کھانا پکانے والی کوئی ملازمہ ہوتی تو پھر تو روزانہ کئی کئی کھانوں کا بھی اوسط رہتا، لیکن جن ایام میں والدہ ماجدہ ہی پکانے والی ہوتیں تو ان دنوں میں بھی یہ سلسلہ کچھ نہ کچھ جاری رہتا، اگرچہ والدہ ماجدہ کی تکلیف کے خیال سے ہم لوگوں پر گراں گذرتا۔ ہمیشہ کی عادت تھی کہ گھر میں آکر بار بار تاکید فرماتے کہ سالن میں پانی زیادہ ڈالو، اور کبھی کبھی خود چولھے پر پہونچکر اپنے ہاتھ سے ڈال جاتے، تاکہ وقت پر کوئی آجائے تو کمی نہ پڑے۔

واقعہ یہ ہے کہ حاجتمندوں اور مسافروں کو کھلانے کا اللہ تعالیٰ نے والد ماجد کو جو حوصلہ دیا تھا اور اس میں ان کو جو لذت آتی تھی وہ اس دور میں اگلے زمانوں کے قصوں کا ایک نمونہ تھا اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اُن کی اسی ایک نیکی کو قبول فرمالے تو انشاءاللہ نجات کے لیے کافی ہے۔

معاشی حالت اور اپنی معیشت مذکورہ بالا حالات و واقعات سے کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ والد ماجد کوئی امیر کبیر اور بڑے دولتمند قسم کے آدمی تھے، واقعہ یہ ہے کہ اُن کی یہ بلند ہمتی اور فراخ دستی محض اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ایک صفت تھی ورنہ وہ آجکل کے معیار کے لحاظ سے اوسط درجہ کے گذارہ کے مالک تھے، بلکہ کبھی کبھی مقروض بھی رہتے تھے اور بعض سالوں میں اُن پر زکوٰۃ کا ایک پیسہ بھی واجب نہ ہوتا تھا مگر داد و دہش کا کم و بیش یہی حال رہتا تھا۔

لیکن اپنی ذات پر ہمیشہ بہت کم خرچ کرتے تھے۔ بہت سادہ کھاتے اور نہایت سادہ پہنتے تھے، بلکہ اس بارہ میں تو ان کا طرز عمل کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا جس پر ناواقفوں کو بخل کا شبہ ہو سکتا تھا، حد یہ ہے کہ بعض اوقات پانی میں صرف نمک ڈال کر اسی سے کھانا کھا لیتے تھے، اور لباس کا حال تو عموماً ایسا رہتا تھا کہ ناواقفوں اور اجنبیوں کے سامنے بعض اوقات ہم لوگوں کو ندامت اور شرم سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔۔۔۔ اب سے تیرہ برس پہلے ۱۳۸۳ھ میں جب سفر حج کا ارادہ فرمایا تو ایک صحبت میں راقم سطور نے حج کی یہ خصوصیت بیان کی کہ یہ عاشقانہ عبادت ہے اور

اس کے ارکان و افعال کسی عاشق مجنوں کی سی حرکتیں ہیں، اسی واسطے اللہ تعالیٰ کو اس میں دیوانوں کی سی صورت اور ہیئت زیادہ پسند ہے، حتیٰ کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہ حاجی زیادہ محبوب ہے جو پراگندہ حال اور میلا کچیلا ہو (الشعث التفل) بہرحال اس عاجز نے کسی صحبت میں یہ مضمون بیان کیا تھا، اس کے بعد خاص روانگی کے دن بلکہ روانگی کے وقت مجھے یہ خیال آیا کہ موسم سرد ہے اور والد ماجد کے ساتھ گرم شیروانی نہیں ہے، میں نے ایک شیروانی چند روز پہلے سلوائی تھی اُس وقت پہنے ہوئے تھا، اُس کے متعلق میں نے والد ماجد سے عرض کیا کہ آپ اس کو اپنے ساتھ رکھ لیجیے! فرمایا تم تو مجھے یہ حدیث سنا چکے ہو کہ "پراگندہ حال اور میلا کچیلا حاجی اللہ کو زیادہ محبوب ہے"! پھر مجھے یہ نئی شیروانی کیوں دیتے ہو، چنانچہ نہیں لی ——— جب حج کا ذکر آگیا ہے تو ایک واقعہ اسی سلسلہ کا اور بھی ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

والد ماجد اس سفر میں اپنی بساط اور استطاعت کے مطابق اپنی سفری ضرورتوں سے فاضل کافی رقم لے گئے تھے، لیکن وہ سب حرمین کے فقراء و مساکین پر اور دوسرے مصارف خیر میں صرف کی اور حجاج عام طور سے جو قیمتی چیزیں خرید کر لایا کرتے ہیں شاید اپنے ہاتھ سے ان میں سے ایک چیز بھی نہیں خریدی، واپسی پر گھر کی ایک بچی نے عرض کیا کہ آپ ہمارے لیے جانمازیں تو لائے ہوں گے، فرمایا بیٹی! میرے نزدیک وہ نماز اچھی ہوتی ہے جو چٹائی پر پڑھی جائے۔ بہرحال یہ تھا اُن کا عام مذاق اور اپنی معیشت کا طرز۔

علم دین سے شغف

خود عالم نہ تھے بلکہ معمولی اُردو فارسی جانتے تھے لیکن دینی جذبہ کی وجہ سے چاہتے تھے کہ اولاد میں اور اولاد کی اولاد میں ایک بھی غیر عالم نہ رہے۔ اُن کے اسی شوق اور جذبہ کا نتیجہ ہے کہ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں اس وقت پانچ فارغ التحصیل عالم ہیں اور دو دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُمید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ اُن کی نسل میں جاری رہے گا۔

تصوف کی عظمت اور صوفیاء سے عقیدت

دین کے شعبوں میں سے تصوف کی عظمت والد ماجد کے قلب میں سب سے زیادہ تھی اور اس لیے دین کی نمائندگی کرنے والے مختلف طبقوں میں سب سے زیادہ عقیدت و وابستگی بھی ان کو صوفیاء

ہی سے تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو دین کی یہ دولت بعض صوفی بزرگوں ہی کی صحبت و محبت سے ملی تھی اگرچہ دین کا اصل جوہر اور مادہ تو ان میں موروثی اور خاندانی تھا لیکن اس کی آبیاری اور ترقی میں بعض صوفی بزرگوں کی صحبت ہی کو خاص دخل تھا۔

بعض غلطیوں کی اصلاح

اس موقع پر ناظرین کی سبق آموزی کے لیے اس حقیقت کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ والد ماجد اپنی جوانی ہی میں جن صوفیوں سے زیادہ متاثر اور مستفیض ہوئے اُن کے جو حالات خود والد ماجد سے سُنے اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرات اگرچہ اپنی نیت میں مخلص اور رضا طلبی میں صادق تھے اور بڑے ذاکر شاغل اور صاحب ریاضت بزرگ تھے لیکن دین کا علم ان بزرگوں کا بہت ناقص تھا اور غالباً کسی عالم ربانی اور محقق صوفی کی صحبت بھی اُن حضرات کو نہیں ملی تھی اس لیے اُن کے طریقے میں بدعات اور علمی و عملی اغلاط کی بہت کچھ آمیزش تھی اور اس کے اثرات والد ماجد میں بھی بہت کچھ تھے اور اب سے بیس پچیس برس پہلے تک اس سلسلے کی بعض غلطیاں گویا اُن کے عقائد کا جزو تھیں اور ان کی اصلاح بڑی مشکل نظر آتی تھی کیونکہ تصوف اور طریقت کے سلسلہ میں وہ عام علماءِ شریعت کی باتوں کو "چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند" کے قبیل سے سمجھتے تھے اور اُن کو "ناآشنائے راز" جانتے تھے ——— خصوصاً جن علماء ربانی نے ہندوستان میں دین کو بدعات سے پاک کرنے کی کوشش کی اور سنت کا علم بلند کیا (مثلاً حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور اُن کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور اس آخری دور میں حضرت مولانا تھانویؒ) ان سب حضرات کو وہ تصوف و طریقت اور حقیقت و معرفت سے ناآشنا ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ بریلی اور بدایوں کی خاص اصطلاح کے مطابق "وہابی" بھی یقین کرتے تھے۔

میرے زمانۂ طالب علمی تک والد ماجد کے خیالات ایسے ہی رہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے اسباب پیدا فرما دیے جن سے ان خیالات کی اصلاح ہوتی رہی اور عمر کے آخری حصہ میں تو بحمد اللہ پوری پوری اصلاح ہو گئی۔

والد ماجد کی سابقہ زندگی میں ایک اصلاح طلب پہلو یہ بھی تھا کہ عبادات اور ذکر و شغل کے شعبہ میں ان کا مقام جتنا بلند تھا، اخلاق و معاشرت و معاملات کے شعبوں میں اتنا بلند نہیں تھا،

اور اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی کہ خود دین کے عالم نہیں تھے اور جن صوفی منش بزرگوں سے وہ متاثر اور مستفیض ہوئے تھے وہ بھی دین کا جامع اور مکمل تصور نہیں رکھتے تھے اور صرف ذکر و تسبیح اور عبادت و ریاضت ہی کو کمال اور ذریعۂ تقرب سمجھتے تھے، لیکن آخر میں اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و توفیق سے ان سب چیزوں کی بھی اصلاح ہو گئی اور ایسی انابت نصیب ہوئی جس پر اُن لوگوں کو بھی رشک کرنے کا حق ہے جو کبھی ان غلطیوں اور کمزوریوں میں مبتلا نہ رہے ہوں۔

فالحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ

معاشی مشاغل یا دنیاداری

والد ماجدؒ کے مذکورۂ بالا حالات سے شاید بعض ناظرین کو یہ شبہ ہوا ہو کہ وہ کوئی گوشہ گیر اور خانقاہ نشین قسم کے صوفی ہوں گے اور دنیوی کاروبار سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں گے۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اُن کی زندگی ایک بڑے مصروف اور جفاکش کاروباری آدمی کی سی زندگی تھی۔ تجارت، زمینداری، کاشتکاری، اُن کے معاشی مشاغل تھے اور وہ بڑی دلچسپی اور بڑی مستعدی اور جفاکشی کے ساتھ اس کاروباری سلسلہ کے سارے کام انجام دیتے تھے ——— اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اگر کوئی اجنبی آدمی ان معاشی مشاغل میں اُن کی مصروفیت اور محنت کو دیکھتا تو ہرگز یہ نہ سمجھ سکتا کہ اس شخص کو اللہ کے ذکر و عبادت سے بھی کوئی خاص اُنس ہو سکتا ہے ——— بلا مبالغہ وہ ذکر و عبادت کی کثرت اور تعلق مع اللہ کے لحاظ سے پورے راہب اور صوفی تھے، اور اپنے کاروباری مشاغل کی مصروفیت اور محنت کے لحاظ سے پورے دنیادار۔ وما احسن الدین والدنیا لو اجتمعا۔

آخری چند مہینوں کا حال

والد ماجد کا سن اسّی سے متجاوز ہو چکا تھا۔ چھ سات مہینہ سے بصارت میں بہت کمی آگئی تھی، قریب کے آدمی کو بھی صورت سے پہچاننا مشکل تھا اور اتنے ہی دنوں سے ایک نئی شکایت یہ شروع ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی (خصوصاً گرمی کی شدت کے وقت) دل بہت گھبرانے لگتا تھا اور ایک طرح کی وحشت سی ہونے لگتی تھی اور اس وقت جی چاہتا تھا کہ کوئی اچھی باتیں کرنے والا ہو تاکہ طبیعت دوسری طرف متوجہ رہے۔

ذکر و تسبیح سے اُن کے ذوق کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور یہ ذوق اُن کو ساری عمر سے تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دینی اصلاحی کتابوں سے اُنھیں کبھی دلچسپی نہیں رہی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرح کی عدم مناسبت تھی مگر جب سے اُن کو دل کے گھبرانے کی یہ شکایت ہوئی تھی اُس وقت سے ان کا حال یہ ہوگیا تھا کہ چاہتے تھے ہر وقت کوئی اُن کو دینی کتابیں پڑھ پڑھ کے سُناتا رہے، یا اللہ کا یا اللہ کے نیک بندوں کا یا آخرت کا تذکرہ ہوتا رہے چنانچہ احادیث نبویہ کے اردو ترجمہ کی چند کتابیں ان کے پاس رکھی رہتی تھیں اور وہ ان کو دوسروں سے پڑھوا پڑھوا کے ہر وقت سُنتے رہتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان آخری چند مہینوں میں احادیث نبویہ سے ایسا ذوق اور اتنی مناسبت و دلچسپی بخش دی تھی کہ جب تک کتاب پڑھی جاتی ان کے دل کو سکون اور چین رہتا اور جیسے ہی وہ سلسلہ منقطع ہوتا دل کی بے چینی اور گھبراہٹ ایک دم اُبھر آتی۔ پھر خشیت اور رقّت ان دنوں میں اتنی بڑھ گئی تھی کہ ترغیب و ترہیب کے سلسلہ کی اکثر حدیثوں پر زار زار روتے اور بار بار استغفار کرتے خصوصاً جن بعض غلطیوں میں اپنی سابقہ زندگی میں کبھی وہ مبتلا رہے تھے جب کوئی حدیث اُن کے متعلق آجاتی تو بعض اوقات بہت متاثر ہوتے کبھی کبھی ہچکیوں سے رونے لگتے اور بڑے الحاح کے ساتھ توبہ و استغفار کرتے اور کبھی بڑی حسرت سے فرماتے، بے علم کے آدمی کچھ نہیں، ہم عمر بھر بے خبر رہے —— حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والد ماجد کی اصلاح کی تکمیل براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و ملفوظات کے ذریعہ فرمائی۔ یہ محض اس رب کریم کا فضل ہی تھا کہ زندگی کے ان آخری دنوں میں احادیث پاک سے ان کو اتنی مناسبت بخش دی گئی کہ گویا وہی ان کے درد دل کی دوا تھی اور اسی سے اُن کے دل کو سکون اور چین حاصل ہوتا تھا۔

والد ماجد کا ایک خواب جب سے والد ماجد کو اختلاج قلب کی مذکورہ بالا شکایت شروع ہوئی تھی اسی زمانہ میں انھوں نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں ان کو آفتاب غروب ہوتا نظر آیا تھا اور اس کی تعبیر انھوں نے یہی کی تھی کہ اب ان کی عمر کا آفتاب عنقریب غروب ہونے والا ہے چنانچہ ہم سب سے انھوں نے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا اور اس کے بعد سے آخرت کی طرف اُن کی توجہ بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور اکثر اوقات حسن خاتمہ کی دُعا فرماتے رہتے تھے ایک دفعہ خود راقم سطور نے سُنا، رو رو کے اللہ تعالیٰ سے عرض کر رہے تھے ——

اے اللہ میرے اعمال جنت کے قابل نہیں ہیں مجھے محض اپنی رحمت سے جنت کے خادموں اور دربانوں میں کر دینا۔

آخری دن اور آخری وقت

اوپر کی سطروں میں دل کی جس گھبراہٹ کا ذکر ہوا ہے........ اس کے علاوہ اور اس کے اثر سے پیدا شدہ ضعف کے سوا کوئی اور خاص تکلیف یا بیماری والد ماجد کو بالکل نہیں تھی، آخری دن تک اپنی معمولی ضرورتیں چل پھر کے خود پوری کرتے رہے اور شب و روز کے نوافل اور اذکار و اوراد کے سارے معمولات بھی انجام پاتے رہے یہاں تک کہ بالکل آخری دن (۴ رمضان دوشنبہ کے دن) مغرب کی نماز پڑھی، حسب معمول اوّابین کی رکعتیں بھی پڑھیں۔ اس کے بعد جب عشاء کا وقت قریب آیا تو سینہ میں خفیف سا درد محسوس ہوا جلدی سے زنانخانے میں تشریف لے گئے وضو کے لیے لوٹے میں پانی لیا اور فرمایا خدا خیر کرے سینہ میں کچھ درد سا ہو رہا ہے نہ معلوم کیا ہے جلدی سے نماز پڑھ لینی چاہیے! چنانچہ لوٹا ہاتھ میں لیے باہر تشریف لائے وضو کیا اور اپنے معمول کے مطابق ۴ رکعت سنت قبل عشاء پڑھی پھر اپنے پوتے محمد عمر سلمہ کو امام بنا کے عشا کی نماز بالکل اول وقت جماعت سے پڑھی اس کے بعد ۲ رکعت سنت بعد عشاء پڑھی پھر اپنے معمول کے مطابق دو نفل پڑھے اور محمد عمر سلمہ کو تاکید کی کہ نفل پڑھنے کی عادت رکھو، فرائض میں جو کمی اور کوتاہی رہ جاتی ہے نفلوں سے اس کی تلافی کی اُمید ہے —— اس کے بعد تراویح پڑھنی شروع کیں لیکن درد میں برابر زیادتی ہوتی رہی یہاں تک کہ ۴ رکعت تراویح پڑھنے کے بعد درد سے بالکل مجبور ہو کر لیٹ گئے اور گھر والوں کو اب معلوم ہوا کہ درد معمولی نہیں ہے، میرے چھوٹے بھائی مولوی حکیم محمد احسن سلمہ نے (جو طبیب بھی ہیں) طبی تدبیریں شروع کیں لیکن تقریباً ایک گھنٹہ تک درد میں بالکل تخفیف نہیں ہوئی بلکہ تکلیف برابر بڑھتی ہی رہی۔ اس پورے وقت میں والد ماجد اللہ کے ذکر و فکر اور توبہ و استغفار اور حسن خاتمہ کی دعا میں مشغول رہے کبھی تسبیح پڑھنے لگتے کبھی ہاتھ اُٹھا کے دعا و استغفار کرتے اور رو رو کر اللہ سے عرض کرتے۔ اے اللہ میرے بس میں کچھ نہیں ہے تو ہی میری مدد فرما، میرا خاتمہ ایمان پر فرما، مجھے معاف فرما دے، مجھے بخش دے۔ قریباً ایک گھنٹہ سوا گھنٹہ یہی کیفیت رہی کہ درد میں شدت ہوتی گئی اور والد ماجد اسی کرب کی حالت میں ذکر و دعا، توبہ و استغفار میں مشغول رہے اس کے بعد یکایک درد میں افاقہ ہونے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں بالکل

سکون ہو گیا۔ چھوٹے بھائی اور والدہ ماجدہ (جو ان کی تیمارداری کی مشغولیت کی وجہ سے نماز اور تراویح نہیں پڑھ سکے تھے) اُن سے باصرار فرمایا کہ اب تم جاؤ اور اپنی اپنی نماز پڑھو میری طبیعت بالکل ٹھیک ہوگئی اور اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ چنانچہ ان کے فرمانے سے حکیم محمد حسن سلمہ بھی نماز پڑھنے چلے گئے اور والدہ ماجدہ بھی زنان خانے میں آکر نماز پڑھنے لگیں۔ والدہ ماجدہ نے عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر تراویح شروع کی ابھی ۱۲ رکعتیں پڑھی تھیں کہ گھر میں جو چراغ روشن تھا وہ اچانک گُل ہو گیا اور اندھیرے سے کچھ وحشت سی ہوئی، بجائے اس کے کہ چراغ کو پھر سے روشن کرنے کی کوشش کرتیں یہ خیال کر کے کہ باہر والد ماجد کے پاس لالٹین روشن ہے، باقی نماز پڑھنے کے ارادہ سے باہر آگئیں۔ والد ماجد ابھی تک بیدار تھے۔ دریافت فرمایا کیا نماز پڑھ آئیں۔ کہا کہ ابھی کچھ باقی ہے یہیں پڑھوں گی، فرمایا اچھا پڑھو، والدہ ماجدہ نے اُن کی نماز کی اُس چوکی پر جو ہمیشہ ان کے پلنگ کے برابر میں رہتی تھی نماز پڑھنی شروع کی ابھی پہلی ہی رکعت تھی کہ والدہ ماجدہ کو ایسا محسوس ہوا کہ والد ماجد کو نیند آگئی اور نیند کی حالت میں ان کے سانس کی جو ایک خاص طرح کی کیفیت اور آواز ہوا کرتی تھی والدہ نے وہی کیفیت اور وہی آواز محسوس کی، پھر دوسری رکعت کا سجدہ کرنے کے بعد جب والدہ ماجدہ نے "التحیات" پڑھنی شروع کی تو ان کو ایک ہلکی سی ہچکی کی آواز آئی اور والد ماجد کو سونے کی حالت میں کبھی کبھی ایسی ہچکی بھی آجایا کرتی تھی جس سے اُن کی آنکھ کھل جایا کرتی تھی اور اس وقت ان کو پانی پینے کی ضرورت ہوتی تھی —— چنانچہ والدہ ماجدہ نے سلام پھیر کے جلدی سے ان کو پانی دینا چاہا لیکن معلوم ہوا کہ غالباً اس ہچکی کے ساتھ ہی ان کی روح دوسرے عالم میں پہونچ چکی اور اب اس دنیا کے پانی کی ان کو ضرورت ہی نہیں رہی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہے لیکن جس طرح اور جس سکون و اطمینان کے ساتھ ان کی موت واقع ہوئی اس سے اندازہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ خاص فضل و کرم فرمایا۔

والد ماجد کی بڑی حسرت اور آرزو تھی اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ سے بڑی دعائیں کیا کرتے تھے کہ ان کے ذکر و عبادت کے سارے معمولات زندگی کے آخری دن تک جاری رہیں، سو

الحمد للہ بظاہر تو ایسا ہی ہوا اور پھر مہینہ بھی رمضان مبارک کا ملا۔ ان سب ظاہری علامتوں سے اور اللہ تعالیٰ کی شان کریمی سے امید یہی ہے کہ ان کے ساتھ خاص لطف و کرم کا معاملہ ہوا ہے لیکن ہمیں یہ کسی حال میں فراموش نہ کرنا چاہیے کہ "اللہ غنی عن العالمین" ہے اور اس کے فیصلے ہم نادانوں کے قیاسوں اور اندازوں کے پابند نہیں ہیں، اس لیے تمام ناظرین کرام سے التجا ہے کہ وہ والد ماجد کے لیے مغفرت و رحمت اور ترقی درجات کی دعا فرمائیں یہ ان کا میرے ساتھ بہت بڑا احسان ہوگا اور اللہ تعالیٰ یقیناً ان کو اجر عظیم دے گا۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ یہ نامۂ سیاہ اکثر وطن سے باہر رہنے کی وجہ سے اُن کی خدمت کے فریضہ سے ہمیشہ قاصر رہا اور نام کی مولویت کی وجہ سے وہ خود بھی اس کا موقع بھی نہیں دیتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد سب سے بڑا قلق اسی تقصیر کا ہے اور اب اس کی تلافی کی اس کے سوا اور کوئی صورت سامنے نہیں کہ ان کے لیے خود بھی دعائیں کروں اور اللہ کے دوسرے بندوں سے بھی دعائیں کراؤں اس لیے تمام ناظرین سے بالخصوص اپنے احباب مخلصین سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ میرا ذاتی کام اور میری ضرورت سمجھ کر پورے الحاح کے ساتھ والد ماجد کے لیے مغفرت و رحمت کی اور ہم پسماندگان کے لیے اس مصیبت کے اجر کی دعا فرمائیں۔ واجرھم علی اللہ

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ علیہ الرحمہ

(ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

قارئین الفرقان اب سے بہت پہلے اخبارات میں مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (علیہ الرحمۃ والغفران) کی خبر وفات پڑھ چکے ہوں گے اگرچہ کسی کی بھی موت اس حیثیت سے غیر معمولی حادثہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں آنے والے ہر انسان اور ہر جاندار کی آخری منزل موت ہی ہے، اور یہ ہر شخص کی جانی بوجھی بات ہے ـــــ لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جن بندوں کی زندگی غیر معمولی ہوتی ہے اُن کی موت بھی اپنے اثرات کے لحاظ سے عام لوگوں کی موتوں کے مقابلے میں غیر معمولی ہی ہوتی ہے، اور دور و نزدیک والے اس سے اس طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح کہ غیر معمولی واقعات و حوادث سے متاثر ہوا کرتے ہیں ـــــ علم دین میں حضرت مفتی صاحبؒ کی بلند مقامی اور خصوصاً فقہ و فتویٰ میں اُن کی مرجعیت اور سیاسیات میں اُن کی خاص بصیرت اور ذہن و فکر کا سلجھاؤ یہ تو وہ چیزیں ہیں جن سے کسی درجہ میں وہ لوگ بھی واقف ہوں گے جنکی واقفیت کا ذریعہ اخبارات یا دوسرے وسائط ہوں گے، لیکن ان کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے غیر معمولی کمالات سے بھی نوازا تھا جن سے صرف وہی حضرات واقف ہوں گے جنھیں نزدیک رہنے اور قریب سے دیکھنے اور برتنے کا زیادہ موقع ملا ہو گا ـــــ یہ عاجز حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی عظمت کا پوری طرح قائل ہونے کے باوجود اُن کے دوسرے قسم کے کمالات سے ہمیشہ زیادہ متاثر رہا ـــــ ان میں سے اُن کے جس کمال کا نقش میرے دل پر سب سے زیادہ گہرا ہے وہ اُن کی بے انتہا تواضع اور بے نفسی ہے، اس بارے میں اس عاجز کا جو تاثر اور احساس ہے واقعہ یہ ہے کہ اُس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ نے ان کو جتنی بلندیاں عطا فرمائی تھیں وہ اتنے

ہی متواضع اور بے نفس تھے، اُن سے ملنے والے اُن کے کسی نیاز مند نے بھی کبھی محسوس نہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے کو کچھ بھی سمجھتے ہیں بعض اوقات اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے اور ایسا معاملہ کرتے کہ انھیں شرم آتی، اس عاجز نے اس مقام کی کسی شخصیت میں کبھی اس درجہ کا تواضع نہیں دیکھا ——— دوسری جس خصوصیت سے یہ عاجز بہت متاثر ہوا وہ یہ ہے کہ سفر و حضر کی سیکڑوں صحبتوں میں میں نے کبھی ان کی زبان سے، نہ نجی گفتگو میں، اور نہ مجلسی بحثوں اور گفتگوؤں میں، کسی بڑے سے بڑے اپنے مخالف کے متعلق بھی کوئی سخت لفظ کبھی نہیں سُنا ——— اسی طرح کبھی غیبت کا کوئی کلمہ سُننا یاد نہیں۔

تیسری خاص بات جس سے یہ عاجز بہت متاثر ہے یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ "كَانَ يَخْدِمُ نَفْسَهُ" (کہ آپ خود ہی اپنے خادم تھے، اپنے گھر اور اپنی ذات کے معمولی معمولی کام خود کر لیا کرتے تھے) ——— حضرت مفتی صاحبؒ اس اُسوۂ نبویؐ کے خاص نمونہ تھے، اس بلند مقامی کے باوجود اپنے گھر کے اور بچوں کے بہت سے ایسے معمولی اور حقیر کام خود کیا کرتے تھے جن کے کرنے میں ایک معمولی آدمی بھی اپنی توہین سمجھے گا ——— واقعہ یہ ہے کہ یہ عاجز حضرت مفتی صاحب کی ان سیرتی خصوصیات سے اتنا متاثر ہے کہ اگر اُن کے ہاتھ پر کھلی کرامتیں دیکھتا تو غالباً اس سے زیادہ متاثر نہ ہوتا۔

حضرت مفتی صاحبؒ اُن اکابر دین میں سے تھے جن کی علمی عظمت و عقیدت اور ان کے علم پر اعتماد کی وجہ سے بہت سے لوگ غلطیوں اور فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں، اس لحاظ سے آپ کی وفات اس دورِ فتن میں ایک بڑا دینی سانحہ ہے۔

اللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُ وَاغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔

عتیق الرحمن سنبھلی

سلطان عبدالعزیز ابن سعود رحمہ اللہ تعالیٰ

(ربیع الاول ۱۳۷۳ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

پرسوں ۱۰ نومبر کو ہم نے بڑے رنج و افسوس کے ساتھ یہ خبر سُنی کہ والی نجد و حجاز سلطان عبدالعزیز ابن سعود انتقال فرما گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون!

اس خبر سے مختلف لوگوں کو مختلف پہلوؤں سے رنج ہوا ہوگا، ہمیں خاص طور سے جس پہلو سے افسوس ہے وہ یہ کہ ایک حامی توحید وسنت اور ماحیِ شرک و بدعت دنیا سے اُٹھ گیا رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین وادخلہ فی جنّت النعیم! —— واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے سلطان کی خدمات کبھی فراموش نہ کی جاسکیں گی، سلطان کی حکومت سے پہلے، حجاز کی وہ سرزمین پاک جس سے توحید وسنّت کا آفتاب طلوع ہوا تھا، جس نے ساری دُنیا پر ہدایت کی شعاعیں بکھیر کر شرک و بدعت کا اندھیرا کافور کر دیا تھا، ایک بار پھر مشرکانہ اعمال اور بدعات کی آماجگاہ بن کر گنبد خضرا میں آرام فرمانے والی روحِ پاک کو خون کے آنسو رلا رہی تھی، سلطان کو اللہ نے جب اقتدار بخشا تو اُس نے "الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر" کا نقشہ کھینچ دیا، اور ان منکرات کبیرہ کے مقابلہ میں ارشادِ نبویؐ "فلیغیّرہ بیدہٖ" کی تعمیل کر کے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں، اس کے علاوہ سلطان کا یہ بھی کارنامہ یاد رہے گا، کہ اس بیسویں صدی میں روئے زمین پر حدود اللہ کے قیام کی کوئی جھلک... اگر دکھائی دیتی ہے، تو صرف اسی کے حدودِ سلطنت میں۔

حال ہی میں حجاز کے کسی رسالہ میں شائع ہوا تھا کہ اقوام متحدہ نے مختلف ممالک سے اُن کا دستور مملکت اپنے ریکارڈ میں رکھنے کے لیے مانگا، تو سلطان مرحوم نے قرآن کریم کا ایک نسخہ بھجوا دیا، کہ :- "ھذا دستورنا!" اگر یہ واقعہ ہے تو "اعتزاز بالدین" کی کتنی بڑی مثال ہے ؟ اور ان باتوں پر جب ہم اس لحاظ سے غور کرتے ہیں، کہ اس نے ایک شخصی سلطنت میں سیاہ و سپید کا تنہا مالک ہوتے ہوئے یہ سب کچھ از خود کیا، رعایا کے مطالبہ سے مجبور ہو کر نہیں! ــــــــ

جبکہ اسلام کے نام پر بنائے گئے "ملکوں" میں عوام کے بنائے ہوئے حکمراں، اپنے ملک کا دستور قرآن و سنت کے مطابق بنانے سے شرماتے ہیں، کتراتے ہیں، اور اپنے عوام کو طرح طرح کے گھسّے دے کر" اس مُلّا ازم" سے بچ کر نکل جانا چاہتے ہیں ــــــ تو قدرتی طور پر سُلطان کی قدر بہت بڑھ جاتی ہے۔

بہت سے لوگوں کو سُلطان کے بعض اقدامات پر اعتراضات بھی ہوں گے اور ہیں مگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے :-

"اذکروا محاسن موتاکم وکفوا عن مساویھم"

تجدید معاشیات | از مولانا عبد الباری ندوی مرحوم ــــ اس کتاب میں معاشیات کے نو پیدا نظریوں اور نعروں سے مرعوب ہوئے بغیر خالص اسلامی و ایمانی تعلیمات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ رزق و معاش کا مسئلہ دراصل کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ دن رات کے معاشی غم و غصہ کی جہنم سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ قیمت ۔/۷

تجدید تعلیم و تبلیغ | از مولانا عبد الباری ندوی مرحوم ــــ خالص اسلامی بنیادوں پر بہترین قوم (خیر امۃ) بنانے کی تعلیمی و تبلیغی تجدیدات و تدابیر کا جامع و مکمل نظام ــــــ یہ تعلیمی و تبلیغی نظام نسلی و وطنی قومیتوں اور سیاسی و معاشی خیال پرستیوں (آئیڈیالوجیوں) کی جہنم سے دنیا کو نجات دلا سکتا ہے۔ قیمت ۔/۵

علاج خوف و حزن | تالیف ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ــــ اس کتاب میں غم و حزن و خوف کے جذبات کی نفسیاتی تحلیل کی گئی ہے اور ان کے رفع کرنے کے لیے روحانی و نفسیاتی طریقوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ قیمت ۳/۷۵

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ

(الفرقان بابت ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ میں شائع ہوا)

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خبر وفات ہمارے ناظرین اب سے کئی ہفتے پہلے اخبارات میں پڑھ چکے ہوں گے ——— اگرچہ حقیقت یہی ہے کہ اس دنیا میں پیدا ہونے والے اور جینے والے کسی آدمی کی موت بھی کوئی غیر متوقع سانحہ نہیں ہے۔ اس دنیا میں جو آیا ہے وہ جانے ہی کے لیے آیا ہے اور یہاں کی ہر زندگی موت ہی پر ختم ہونے والی ہے، اس لیے کسی زندہ شخص کا مرجانا نظری طور پر ایسا ہی ایک واقعہ ہے جیسا کہ ہر دن کے بعد رات کا اور رات کے بعد دن کا آنا ——— لیکن اللہ کے جن بندوں کی زندگی زیادہ قیمتی اور زیادہ نفع رساں ہوتی ہے ان کا اس دنیا سے جانا ایک غیر معمولی قسم کا سانحہ ہی ہوجاتا ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔

سید صاحب اس دور میں نہ صرف ہندوستان و پاکستان کے بلکہ پوری اسلامی دنیا کے ممتاز ترین اور مشہور ترین رجالِ علم و دین میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے علم و دین کا وہ کام لیا جس کی توفیق خاص بندوں ہی کو ملتی ہے ——— دوسرے علمی و دینی کاموں کے علاوہ صرف "سیرۃ النبیؐ" ہی کا کام اگر غور سے دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ توفیق الٰہی کا خاص کرشمہ ہے۔

اپنے کسی بندہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص الخاص فضل ہوتا ہے کہ اس کو کسی اچھے اور بڑے کام کی صلاحیت بھی بخشی جائے اور اسی کام کی لگن اس کے دل میں لگا کر اس میں اس کو مشغول بھی کردیا جائے اور ضروری اسباب بھی اس کے لیے فراہم کردیے جائیں، سید صاحب کی زندگی اور ان کے کام کو دیکھنے والے ہر شخص کو صاف نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ خاص عنایت و توفیق اُن کی رفیق تھی۔

دوسرا بہت بڑا فضل سید صاحب پر اللہ تعالیٰ کا یہ ہوا کہ اس علمی امتیاز و تبحر اور عالمی شہرت و وقعت کی ان تمام بلندیوں کے حاصل ہونے کے باوجود جو ہندوستان کے کسی عالم دین کو حاصل ہو سکتی تھیں ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے قلب و روح کے تزکیہ و تجلیہ کی طلب پیدا فرمائی اور پھر اس راستہ کے طے کرنے کے لیے کسی صاحب ارشاد شیخ کی رہنمائی کی ضرورت بھی انھوں نے محسوس کی اور اس کے لیے جب ان کی نظر انتخاب حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ پر پڑی تو "ندویت" و "دیوبندیت" کا فاصلہ مولانا شبلی مرحوم اور حضرت مولانا تھانوی کے طرز کا غیر معمولی فرق اور بہت سے مسائل میں خود اپنی رائے اور تحقیق کا اختلاف جیسے جو بہت سے حجابات سدراہ ہو سکتے تھے ان میں سے کوئی بھی سید صاحب کا راستہ نہ روک سکا ـــ اور اللہ کے بندے نے جس طرف جانے میں خیر دیکھا اس طرف بڑھا ہی چلا گیا۔

اس عاجز کے نزدیک تو سید صاحب کا یہ اقدام ہی ایک ایسا مجاہدہ تھا کہ "خود شکنی" کی کٹھن گھاٹی تو اسی سے طے ہو گئی ہوگی، اور عارفوں کا کہنا ہے کہ اس دشوار گزار گھاٹی کو عبور کر لینے کے بعد راستہ بہت ہی مختصر رہ جاتا۔

بہرحال سید صاحب پر اللہ تعالیٰ کا یہ بھی خاص الخاص فضل ہوا اور ان کو ظاہر و باطن کی وہ جامعیت عطا فرما دی گئی جو انبیاء علیہم السلام کی خاص میراث ہے۔

وَفِي ذَالِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ

سید صاحب کا اس دنیا سے جانا ہم پسماندگان کے لیے بلاشبہ ایک رنجدہ سانحہ ہے لیکن خود ان کے لیے انشاء اللہ ایسی ترقی ایسی بلندی اور ایسی نعمت ہے کہ اگر اس دنیا میں اس کا مشاہدہ ہو جائے تو اس کے اشتیاق میں اس زندگی کا ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہو جائے اور یہاں کا جینا عذاب معلوم ہونے لگے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے ساتھ رحمت و مغفرت اور قبولیت کا خاص معاملہ فرمائے اور ان کی دینی خدمات کا اپنی شانِ عالی کے مطابق صلہ عطا فرمائے اور ان کے علمی فیوض سے فائدہ اٹھانے کی بعد والوں کو توفیق دے۔

محمد منظور نعمانی

اپنے شفیق ترین استاذ کی یاد میں

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(رجب ۱۳۷۴ھ مارچ ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

انا للہ وانا الیہ راجعون ——— وانا بکم یومئذٍ للاحقون

یہ ناچیز ۲۰ر فروری سے کل ۱۱ر مارچ تک احباب کے ایک تبلیغی قافلہ کے ساتھ سفر میں رہا اور ۲۰ دن کے بعد آج ۱۲ر مارچ کو لکھنؤ واپس پہونچا ہے۔ آج سے تین دن پہلے ۹ر مارچ کو ہمارا قافلہ کٹھیار (ضلع پورنیہ بہار) میں تھا۔ وہاں کے مدرسہ "دار العلوم لطیفیہ" میں ہمارا قیام تھا، قریباً ۹ بجے دن کا وقت ہوگا کہ مدرسہ مذکور کے مدرس مولانا عبدالرزاق صاحب ایک تار ہاتھ میں لیے نہایت غمزدہ صورت میں دوڑے ہوئے آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا کہ "دیوبند سے آیا ہوا یہ تار ہے بہت بڑا حادثہ ہوگیا" میں نے پوچھا کیا خبر ہے؟ انھوں نے جواب دیا اطلاع یہ ہے کہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کا انتقال ہوگیا"!

اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی گھڑی کسی کی بھی موت کوئی موجب حیرت واقعہ نہیں ہے۔ لیکن چونکہ حضرت مولانا کی علالت کی کوئی اطلاع اس سے پہلے نہیں تھی، اس لیے تھوڑی دیر تو بس تحیّر ہی کی کیفیت رہی لیکن بالآخر یقین کرنا پڑا، اُٹھ کر وضو کیا، کچھ نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے اپنے نہایت شفیق استاذ کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کی۔ ———

کٹھیار سے روانہ ہونے کے بعد کل گورکھپور میں اخبارات میں بھی یہ خبر پڑھ لی۔ اپنے ناظرین کرام سے گزارش ہے کہ وہ بھی حضرت مرحوم کے لیے مغفرت و رحمت اور ترقی درجات کی دعا

فرمائیں، راقم الحروف پر بھی ان کا یہ احسان ہوگا۔

سب جانتے ہیں کہ اس دنیا کی حقیقت ایک سرائے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مسافروں کی آمد و رفت کا تانتا بندھا ہوا ہے، روزانہ ہزاروں بلکہ لاکھوں آتے ہیں اور جاتے ہیں، اس لیے کسی کا یہاں سے کوچ کر جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ کے بعض بندے کچھ ایسی افادی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں کہ ان کا اس دنیا سے جانا کسی قوم یا جماعت کے لیے واقعۃً بہت بڑا حادثہ ہوتا ہے، اس لیے اُن سے تعلق رکھنے والوں کو اُن کی موت سے غیر معمولی رنج اور صدمہ پہونچتا ہے ــــــ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ بھی اللہ کے ان ہی بندوں میں سے تھے۔

اِس وقت کسی مفصل تذکرہ کی تو گنجائش نہیں صرف چار صفحے کی محدود وسعت کو پیش نظر رکھ کر حضرت ممدوح کی زندگی کے بعض پہلوؤں کے متعلق چند سطریں الفرقان کے ناظرین کرام کے لیے لکھنا چاہتا ہوں، اس سے انشاء اللہ کچھ اپنے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔

حضرت مولانا سے میری ابتدائی واقفیت

حضرت مولانا نے اپنے ابتدائی دور میں فقہ اور ادب کی بعض درسی کتابوں پر جو حواشی لکھے تھے اور درس کے انداز میں جو غیر معمولی خصوصیت پیدا کر لی تھی اُس کی وجہ سے علمی اور درسی حلقوں میں اپنے ابتدائی زمانہ ہی میں حضرت مولانا کو خاص شہرت اور عظمت حاصل ہو گئی تھی، اب سے ۴۳-۴۵ سال پہلے جبکہ راقم الحروف عربی کی ابتدائی متوسط کتابیں پڑھتا تھا، خوب یاد ہے کہ اُس وقت کے میرے بعض اساتذہ حضرت مولانا کی علمی اور درسی خصوصیات کے بہت تذکرے کیا کرتے تھے، میں نے پہلے پہل حضرت مولانا کا نام اپنے ان استادوں ہی سے سنا تھا۔

دارالعلوم میں میری حاضری اور حضرت مولانا کا تدریسی امتیاز

شوال ۱۳۴۳ھ میں یہ ناچیز دارالعلوم دیوبند گیا اور دو سال وہاں رہا، پہلے سال میں "ہدایہ اخیرین" "سبعہ معلقہ" اور دوسرے سال میں "تفسیر بیضاوی" سورہ بقرہ (جو اُس وقت دورۂ حدیث کے ساتھ پڑھائی جاتی تھی) اور "شمائل ترمذی" مولانا ہی سے سبقاً سبقاً پڑھیں، اُس وقت کا اپنا خیال اور اندازہ یہ تھا اور آج تک بھی اس میں کوئی

فرق نہیں آیا ہے کہ مولانا مرحوم ان کتابوں کو اس طرح پڑھاتے تھے کہ اگر ان کے مؤلفین و مصنفین علامہ مرغینانی اور امام ترمذی اور قاضی بیضاوی اور امراء القیس وغیرہ اصحابِ معلقات، مولانا کا درس سنتے تو انھیں یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوتی کہ ان کی کتابوں کا کیا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ خاص کر "ہدایہ اخیرین" کا درس تو اتنا ممتاز ہوتا تھا کہ علمی اور درسی ذوق رکھنے والے اہلِ علم جنھوں نے بار بار ہدایہ اخیرین پڑھائی ہوتی، مولانا کا درس سن کر ان کا بھی جی چاہنے لگتا کہ ایک دفعہ ہدایہ اخیرین مولانا سے پھر پڑھیں، اور بعض حضرات نے ایسا کیا بھی۔

بے پناہ محنت اور بے انتہا مصروفیت

حضرت مولانا کا خاص وصف جس میں اب تک ان کا کوئی ثانی نہیں دیکھا گیا وہ ان کی بے پناہ محنت اور بے انتہا مصروفیت تھی، میرا خیال ہے کہ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں دوپہر اور رات کے سونے کے چند گھنٹوں کو نکال کر (جو میرے اندازہ میں ۴-۵ گھنٹوں سے زیادہ نہ ہوتے ہوں گے) اگر کوئی شخص اس کی کوشش کرتا کہ ان کو کسی وقت فارغ اور غیر مشغول دیکھ سکے تو مہینوں نہ دیکھ پاتا۔ ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ آدمی اپنے وقت کی قدر کرے تو کتنا کام کر سکتا ہے۔ بلا مبالغہ وہ روزانہ اتنا کام کرتے تھے کہ اوسط درجے کے کام کرنے والے ۴-۵ آدمی مل کر بھی اتنا کام عام طور سے نہیں کرتے۔

شیخ الادب والفقہ اور صدر مفتی و ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند

درسی علوم میں فقہ اور عربی ادب میں حضرت مولانا کو چونکہ خاص الخاص مہارت تھی اس لیے دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والی علمی برادری میں عام طور سے ان کو "شیخ الادب والفقہ" کہا اور لکھا جاتا تھا ــــ ایک عرصہ تک وہ دارالعلوم کے صدر مفتی بھی رہے لیکن بعد میں تدریس اور نظامت تعلیم کی ضروریات نے دارالعلوم کے اہل حل وعقد کو مجبور کیا کہ دارالعلوم کی صدارت افتا کے لیے کسی اور کا انتخاب کیا جائے اور تدریس اور نظامتِ تعلیم کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

تحریر و تصنیف

ہمارے قدیم طرز کے علماء میں علمی رسوخ کے باوجود تحریر پر قدرت اور تصنیف کا اچھا ذوق رکھنے والوں کی کمی رہی ہے لیکن مولانا مرحوم صاحبِ علم و

درس ہونے کے ساتھ صاحب قلم بھی تھے اور سلیس و شگفتہ اردو لکھنے والوں میں تھے۔ دارالعلوم دیوبند کا قدیم ماہنامہ "القاسم" جس دور میں دارالعلوم کی علمی شان کے مطابق ایک معیاری دینی و علمی ماہنامہ تھا اس زمانہ میں کافی عرصہ تک اس کی ادارتی ذمہ داریاں عملاً مولانا ہی سے متعلق تھیں ——— القاسم کی پرانی جلدوں میں آپ کے بعض مضامین اب بھی ایسے محفوظ ہیں جو آپ کے طرز نگارش کا اچھا نمونہ ہیں۔

انتہائی شفقت کے ساتھ انتہائی رعب

طلبہ کے حق میں حضرت مولانا اس قدر شفیق تھے کہ اس کی مثال نہ دیکھی نہ سُنی۔ خاص کر جو طالب علم پڑھنے میں محنتی اور نیک سیرت ہوتے، مولانا اُن سے بالکل اپنی اولاد کی طرح محبت فرماتے، اُن کو اوقات مدرسہ کے علاوہ بعض اوقات کئی کئی سبق پڑھاتے، دن میں کوئی وقت خالی نہ ہوتا تو رات کے اوقات میں پڑھاتے۔ حد یہ ہے کہ اگر وہ حافظِ قرآن ہوتے تو قرآن مجید سننے کے لیے بھی وقت نکال لیتے، اگر کوئی وقت نہ نکل سکتا تو تہجد میں ان کو امام بنا کر ان کا قرآن سنتے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنھوں نے دیکھا نہیں ان کو طلبہ کے ساتھ حضرت مولانا کی محبت و شفقت کا اس زمانہ میں کسی طرح اندازہ نہیں کرایا جا سکتا، لیکن آپ کی یہ محبت اور شفقت، ماں والی محبت و شفقت نہ ہوتی جو بسا اوقات بچہ کو بے تکلف اور بے باک بھی بنا دیتی ہے، بلکہ ایک باوقار اور پُر رعب باپ کی سی محبت و شفقت ہوتی جو طالب علم کو مولانا کا گرفتار اور گرویدہ تو بنا دیتی لیکن اس میں بے تکلفی کبھی نہ آسکتی ——— آپ کی سیرت کا یہ پہلو حضرت فاروق اعظمؓ سے بہت مشابہ تھا۔ اسی لیے طلبہ جس قدر اُن کے سامنے باادب اور محتاط رہتے اور جتنا اُن سے ڈرتے اس ناچیز نے خود اپنی طالب علمی کے زمانے میں دیکھا کہ اُن کے بھی اکابر مثلاً استاذ نا حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے کبھی نہیں ڈرتے تھے، مولانا کا یہ فاروقی طرز عمل طلبہ کے لیے جس قدر مفید اور ان کی سیرت کا جیسا محافظ تھا اس کا اندازہ صرف انھیں کو ہوگا جو اس دور میں کچھ عرصہ دارالعلوم میں طالب علم بن کر رہے ہیں۔

بے مثال تواضع

اس وقار اور اس فاروقی رعب و جلال کے ساتھ تواضع اور کسر نفسی اس قدر تھی کہ جن کو خود واسطہ نہیں پڑا ان کو اب کسی طرح سے کوئی اس کا اندازہ

نہیں کرا سکتا۔ ہر شخص کو پہلے سلام کرنے کے وہ اتنے حریص اور اس معاملہ میں اس قدر مشتاق اور اور چابکدست تھے کہ اُن کے قریباً سبھی نیازمندوں نے جن کی تعداد ہزاروں ہوگی مدتوں اس کی کوشش کی ہوگی کہ پہلے سلام کرنے کی سعادت کبھی انھیں حاصل ہو، لیکن راقم سطور کے ساتھ وہ سب شہادت دے سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ ہمیشہ ناکام اور شکست خوردہ رہے۔ حضرت مولانا کا عام قاعدہ تھا کہ نگاہ نیچی کیے تیز چلتے اور جیسے ہی کوئی شخص سلام کی زد پہ آجاتا (یعنی اتنے قریب ہوجاتا کہ وہ سلام سُن سکتا) تو اچانک اس کی طرف نگاہ اُٹھاتے اور نگاہ کے ساتھ ہی زبان اپنا کام کرتی اور اس بیچارے کو وعلیکم السلام ہی عرض کرنے کا موقع ملتا۔ دارالعلوم میں پڑھنے والے طالب علموں کے سوا جو شخص ملنے آتا عموماً اُس کے لیے کھڑے ہوجاتے۔ یہاں تک کہ آپ کے جو شاگرد طالب علمی کے زمانہ میں آپ کے خاص خادم اور نیازمند رہے ہوتے وہ بھی جب بعد میں کبھی حاضر ہوتے تو حضرت مولانا ہمیشہ کھڑے ہوجاتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ پہلے انھیں بیٹھنے پر مجبور کرتے اور بعد میں خود بیٹھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ تواضع اور دوسروں کے اکرام کی یہ صفت اس درجہ تھی کہ جو شخص آپ کو نہ جانتا اُسے بسا اوقات تصنع اور بناوٹ کا شبہ ہوسکتا تھا۔

افسوس صد افسوس کہ ان اوصاف و کمالات کی حامل و جامع ہستی ہم سے جدا ہوگئی!

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ وانزل علی روحہ وجسدہ وتربتہ شآبیب رحمتک ورضوانک واجعلہ من عبادک المقربین۔ آمین یا ارحم الراحمین!

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح

(رمضان و شوال ۱۳۷۵ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے سانحۂ وفات کا علم اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ناظرین الفرقان کو اب سے چند روز پہلے ہو چکا ہوگا ــــــ اگرچہ یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں آنے والے ہر مسافر کی آخری منزل موت ہی ہے، اور اس لیے ہر زندہ کے متعلق ہم سب کو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ یہ ضرور ایک نہ ایک دن مرنے والا اور مُردوں سے جا ملنے والا ہے۔ اور خاص کر مولانا مرحوم کا حال تو کئی سال سے یہ تھا کہ خطوط میں برابر تحریر فرماتے رہتے تھے کہ "موت و حیات" کی درمیانی منزل میں ہوں۔ نیز پچھلے دو تین سالوں میں کئی بار ایسے دورے پڑے کہ تیمارداروں کو مایوسی ہوگئی۔ ان حالات میں آپ کے سانحۂ وفات کی اطلاع آپ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے بالکل غیر متوقع نہ تھی اور اس لیے عقل عام کا تقاضا بظاہر یہی تھا کہ دل زیادہ محزون اور متاثر نہ ہوتا۔ لیکن دل کی واردات عقل کے تابع نہیں، خبر سُن کر جو کچھ دل پر گزری وہ بیان میں آنے کی چیز نہیں۔

مولانا مرحوم سے گوناگوں ذاتی تعلقات بھی تھے لیکن آج جو چیز سب سے زیادہ یاد آرہی ہے اور جس سے محروم ہوجانے کا خاص صدمہ ہے وہ مولانا مرحوم کی ممتاز علمی حیثیت اور ان کے علم کی خصوصی افادیت ہے۔

سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ہمارے اس دور میں پچھلے تمام دوروں سے زیادہ ضرورت ایسے اہل علم کی ہے جن کی نظر وسیع اور ذہن روشن ہو۔ اور اسی کے ساتھ دل خدا آشنا اور خدا ترس ہو۔ اور جو سلف کے پورے اتباع کے ساتھ عصر جدید کی خصوصیات اور اس کے تقاضوں

کو بھی سمجھنے والے اور اس سے پیدا ہونے والے مشکل مسئلوں کو حل کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ہوں۔
اور یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو بڑی فیاضی سے عطا فرمائی تھیں ـــــ مولانا مرحوم کی ان علمی خصوصیات کی قدر و عظمت کا احساس الحمدللہ پہلے بھی تھا، لیکن اب اس نعمت کے چھن جانے کے بعد یہ احساس بیسیوں گنا بڑھ گیا ہے۔ اس لیے جتنا بھی غم اور صدمہ ہو بجا اور برحق ہے ـــــ تاہم یہ چیز فی الجملہ تسلی دینے والی ہے کہ اپنی بہت سی تصانیف اور لاتعداد مجلاتی مقالات کی شکل میں جو ورثہ آپ نے چھوڑا ہے اس میں بھی آپ کے علم و مطالعہ اور نتائج فہم و فکر کا کافی حصہ آگیا ہے اور بہت کچھ فائدہ اس سے اٹھایا جاسکتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ رحمت و مغفرت کا خاص معاملہ فرمائے اور سید عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خواص اہل محبت کے ساتھ آپ کو جو والہانہ اور نیم مجذوبانہ گرویدگی اس زندگی میں عطا فرمائی گئی تھی ـــــ "المرء مع من احب" ـــــ کے کریمانہ منشور کے مطابق اگلی زندگی میں اُن سب کی رفاقت و معیت آپ کو نصیب ہو۔

اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔ آمین

عتیق الرحمٰن سنبھلی

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کی وفات

(جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۷۷ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

آہ کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ۱۲ جمادی الاولیٰ (مطابق ۵ دسمبر) کو اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے اور اپنے پیچھے ہزاروں شاگردوں، لاکھوں ارادتمندوں اور کروروں اہلِ عقیدت وارباب محبت کی ایک دنیا چھوڑ گئے جو اپنی ویرانی پر اشکبار اور دل فگار ہے اور مدتوں رہے گی۔ قدس اللہ سرہٗ ونور ضریحہ

آہ! کہ آج بزمِ عرفان سونی ہے، محرابِ انسانیت بے نور ہے۔ مسندِ علم کی رونق جا چکی ہے، اور محفلِ طریقت جانِ محفل کو رو رہی ہے۔

جو جانتے ہیں انھیں تو بتانا کیا، پر جو نہیں جانتے، آہ! انھیں کیسے بتایا جائے کہ اس ایک ذات سے محروم ہو کر ہم کس دولت سے محروم ہو گئے ہیں! —— آہ! وہ سلفِ صالحین کی چلتی پھرتی یادگار، وہ مجسمہ زہد و ایثار، وہ پیکرِ تقدس، وہ کوہِ استقامت، وہ جلوہ نمائے خلقِ احمدؐ، اب ہم کہاں دیکھ پائیں گے؟ —— جسے دیکھ کر ایمان کے بجھے ہوئے ذرات میں تازگی پیدا ہوتی تھی جس کا قرب پا کر دلوں میں ذوقِ عمل اور تعلق باللہ کی اُمنگ بیدار ہوتی تھی جس نے اس دورِ انحطاط میں ہر طرح کے مواقع کے باوجود زہد و ایثار ہی کو اپنی اصل دولت سمجھا، جس نے گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر نہیں کارزارِ حیات کے اُن میدانوں میں رہ کر بھی اپنے دامنِ تقدس کو بے داغ رکھا جہاں دامنِ تقدس سنبھالے نہیں سنبھلتا اور انسان معذرت خواہ ہوتا ہے کہ

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردئی
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

جس نے چودھویں صدی میں عزیمت و استقامت کی اُن مثالوں کو دہرایا جو اربابِ عزیمت کی تاریخ میں امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے نقش کی ہیں، اور جس نے اپنے روز و شب اپنے عادات و اطوار اور اپنے اخلاق کو اسوۂ حسنہ سے اس قدر قریب کر رکھا تھا کہ بخدا پڑھا اور سنا ضرور ہے مگر آنکھوں سے اس کی مثال

نہیں دیکھی!

یہ شاعری اور عقیدت کی کرشمہ کاری نہیں، کہ لکھنے والے کی افتادِ طبع اس قسم کی عقیدت مندی سے کوسوں دور ہے۔ یہ جو کچھ قلم سے نکل رہا ہے حقیقت کا جچا تُلا اظہار اور واقعات و مشاہدات کے حقیقی تاثرات ہیں۔ اور جس شخص نے بھی کھلے دل کے ساتھ مولانا کی کتابِ حیات کو دیکھنے کا کچھ موقع پایا وہ خواہ شاگرد نہ ہو، مرید نہ ہو بلکہ بالکل غیر اور کسی مستقل مکتبِ فکر کا فرد رہا ہو اس کے تاثرات بھی یہی سامنے آئے ہیں۔

۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء کی بات ہے اسی قسم کے ایک صاحب نے اُس وقت کی ایک بڑھتی ہوئی شخصیت اور دین کے ایک پُرزور داعی سے ملنے کے بعد ان کے ایک پُرجوش رفیق سے جو الفاظ کہے تھے جو انھیں کے واسطہ سے مجھ تک پہونچے وہ آج کانوں میں گونج رہے ہیں، انھوں نے کہا تھا کہ "باتیں سب ٹھیک! مگر اس کو کیا کریں کہ اتنی ساری دیر میں یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ کسی دینی شخصیت کے پاس بیٹھے ہیں اس کے برعکس مثلاً مولانا حسین احمد کے پاس بیٹھتے ہیں تو خدا یاد آتا ہے"

حقیقت یہی ہے کہ یہ مبارک ہستی جو اپنے تعلق باللہ اور اپنی باطنی کیفیات کو عمر بھر ایک راز کی طرح چھپاتی رہی اس کا چہرہ اس راز کو ہر اس شخص پر فاش کرتا تھا جس کی نظر کی راہ میں کوئی قلبی غبار نہ حائل ہو رہا ہو، اور یہ نظارۂ حالِ دل ہر اس شخص کے دل پر اثر انداز ہوتا تھا جس کے دل پر غفلت کی مہر نہ لگی ہوئی ہو۔

آہ! یہ دولتِ نایاب اب کہاں؟ ——— اب کہاں وہ صحبتیں؟ کہاں وہ مجلسیں؟ جہاں اس آسانی سے دل بیدار ہو جاتا تھا۔ اور مدتوں کی غفلت چند لمحوں کے لیے تو کافور ہو ہی جاتی تھی!

آہ! کیا خلوص و للّہیت کا یہ نمونہ پھر دیکھنے کو ملے گا، جس نے مختلف میدانوں کے صاحبِ کمال کو اپنے کسی کمال کی قیمت وصول کرنے کی اجازت نہیں دی اور وہ اس شان سے دنیا سے گیا کہ اپنا سب کچھ لٹا گیا مگر کسی کے خراجِ تحسین کا بھی روادار نہ ہوا!

اسے خلوص و للّہیت اور استقامت کی بے پناہی کے سوا کیا کہیے کہ تیس برس تک سیاست کی وادیٔ پُرخار میں رہ کر بھی اس کی قبائے تقدس اسی طرح سلامت رہی جس طرح مدرسہ و خانقاہ کے گوشۂ عافیت میں محصور رہ کر رہ سکتی تھی۔ نہیں! بلکہ وہ انھیں روز و شب میں تقویٰ و طہارت، خوف و خشیت اور عشق و محبت کی بھی مزید منزلوں پر منزلیں طے کرتا رہا ——— یہاں تک کہ جب اس میدان

سے پٹا تو وہ سراپا سوز و گداز تھا!

اور استقامت کے اس مظاہرہ پر کیوں نہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی یاد آنے لگے گی کہ ۱۹۲۱ء میں انگریزی فوج اور پولیس میں مسلمانوں کی ملازمت کی حرمت کا فتویٰ دینے پر جب وہ گرفتار کر کے کراچی کی عدالت میں لایا گیا تو جلال و جبروت کے دم بخود کر دینے والے مظاہروں کے بیچ میں کھڑے ہو کر اس نے ببانگ دہل پکارا کہ

"ہاں میں کہتا ہوں کہ انگریزی فوج اور پولیس میں مسلمانوں کے لیے ملازمت کرنا حرام ہے۔"

اور وہ اخلاق و کردار اور عادات و اطوار میں "خلق احمد کی جلوہ نمائی" یہ تو اس کی زندگی کا وہ حسین باب ہے کہ جس کی نظر سے اس باب کے کچھ اوراق گزر گئے وہ محبت اور والہانہ محبت کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اور حق یہ ہے کہ "اخلاق محمدی" کی تاثیر پر الحمد للہ ایمان تھا اور شرح صدر کے ساتھ تھا۔ مگر مولانا کو قریب سے دیکھ کر گویا (بلا تشبیہ) اس تاثیر کا مشاہدہ ہو گیا۔

مگر آہ! کیا پتہ تھا کہ یہ سب ایمان پرور اور مسرت بخش مناظر ایک دن دل کے داغ بن جائیں گے اور پھر ان داغوں کو بھی عزیز رکھنا پڑے گا۔

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد!

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ

میری واقفیت اور تاثرات

(شمارہ بابت جمادی الآخرہ ۱۳۷۷ھ میں شائع ہوا)

غالباً ۱۳۳۸ھ کی بات ہے میں اپنے وطن سنبھل کے عربی مدرسے "مدرسۃ الشرع" میں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا میری عمر اس وقت ۱۴ سال کی ہو گی۔ حضرت شیخ الہندؒ کا نام میں اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا اس لیے قلب میں ان کی خاص عظمت تھی۔ اسی زمانہ میں یہ خبریں آئیں کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر عنقریب تشریف لانے والے ہیں، اگرچہ چالیس سال پہلے کی بات ہے مگر مجھے کل کی طرح یاد ہے کہ مدرسہ کے سن رسیدہ مہتمم جناب منشی حمید الدین صاحب مرحوم (جن کو حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی سے بیعت و ارادت کا شرف حاصل تھا) ایک دن مدرسہ تشریف لائے اور حضرات اساتذہ کو اپنی ایک تازہ نظم سنائی جس میں حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کی خوشخبری پر اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی نظم میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیقوں اور خاص خادموں کی حیثیت سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عزیر گل صاحب کا نام سنا۔

پھر کچھ عرصے کے بعد سننے میں آیا کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لے آئے۔ غالباً یہ تشریف آوری رمضان مبارک ۱۳۳۸ھ میں ہوئی تھی۔ شروع شوال میں جب عربی مدارس کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے میرے والد ماجد نے آئندہ تعلیم کے لیے مجھے دہلی استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مرحوم کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ فرمایا (مولانا مرحوم اُن دنوں مدرسۂ عبد الرب دہلی میں مدرس تھے) مولانا نے نظام سفر اس طرح بنایا کہ پہلے اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لیے دیوبند

جائیں گے اور پھر وہاں سے دہلی۔ مجھے بھی اس کی خوشی تھی کہ حضرت شیخ الہند کی زیارت نصیب ہوگی۔ اُس زمانہ میں میرے وطن سنبھل اور مرادآباد کے درمیان ٹرین نہیں چلتی تھی اس لیے سنبھل سے مرادآباد تک سفر گھوڑے تانگہ سے ہوا، مرادآباد پہونچکر دیوبند کے لیے ٹکٹ خرید لیے گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد مرادآباد کے ایک بزرگ سے حضرت استاذ کو یہ معلوم ہوگیا کہ حضرت شیخ الہند آج ہی دیوبند سے فتح پور ہسوہ روانہ ہونے والے ہیں اس لیے اس وقت دیوبند پہونچکر حضرت کی زیارت نہ ہو سکے گی۔ افسوس کے ساتھ خریدے ہوئے وہ ٹکٹ واپس کر دیے گئے اور دہلی کے ٹکٹ لے کر براہ راست دہلی روانہ ہو گئے — صبح کو جب ہم دہلی پہونچکر مدرسہ عبدالرب میں داخل ہوئے تو وہاں فرش و فروش کا کچھ غیر معمولی اہتمام دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند اسی وقت تشریف لارہے ہیں شام تک یہیں مدرسہ میں قیام رہے گا اور آج ہی یہاں سے فتح پور کے لیے روانگی ہو جائیگی اُستاذ مرحوم اور اس ناچیز کو بھی یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی، تھوڑی ہی دیر کے بعد حضرت اپنے رفقاء سمیت تشریف لے آئے، ناچیز کو بھی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، مولانا عزیز گل صاحب خادم خاص کی حیثیت سے ساتھ تھے ان کی زیارت بھی سب سے پہلے اسی وقت ہوئی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا نام نامی سُن چکا تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا، دریافت کرنے پر کسی سے معلوم ہوا کہ مولانا اس سفر میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ نہیں ہیں۔

چند مہینے کے بعد (صفر یا ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں) حضرت شیخ الہند کا وصال ہوگیا۔ مالٹا سے حضرت کی آمد پر خلافت کی تحریک میں ایک دم وسعت اور طاقت پیدا ہوگئی، ملک بھر میں خلافت کے نام پر جلسے اور کانفرنسیں ہونے لگیں۔ ہمارے وطن سنبھل میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں قریب قریب وہ سب بڑے علماء تشریف لائے جو خلافت کی تحریک میں اس وقت نمایاں اور پیش پیش تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی بھی تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے کہ مدنی نسبت اور اسارت مالٹا کی وجہ سے ہر شخص کو دوسرے بزرگوں سے زیادہ حضرت مولانا ہی کی زیارت کا شوق تھا۔ کم عمری کے باوجود میرا بھی یہی حال تھا، حضرت مولانا کی پہلی زیارت اسی موقع پر ہوئی۔ خوب یاد ہے کہ حضرت مولانا جدھر کو نکلتے تھے مشتاقان زیارت کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔

مولانا نے اس جلسہ کی اپنی تقریر میں ترکوں کے حراریاں تکلیفوں مصیبتوں اور بربادیوں کی تفصیل بھی

بھی بیان فرمائی تھی جن سے پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں اہلِ مدینہ کو گزرنا پڑا۔ یہ واقعات ہر مسلمان کے لیے بہت دردناک تھے۔ مجھے اب تک اس تقریر کے خاصے اجزا یاد ہیں۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا گرفتار کر لیے گئے اور وہ تاریخی مقدمہ چلا جو کراچی کے مقدمہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس قید سے رہائی کے بعد اپنی طالب علمی کے دور میں دوسری دفعہ مولانا کی زیارت مرادآباد کے جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نجد کے سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا تھا اور شریف حسین کو وہاں سے چلا جانا پڑا تھا، خبریں آرہی تھیں کہ شریف حسین بعض یوروپین طاقتوں سے مدد حاصل کر کے نجدیوں سے جنگ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، اور اندیشہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یہ جنگ سرزمین حرم پر ہوگی۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں ایک رزولیشن پیش کیا گیا تھا جس میں شریف حسین کے اس ارادے پر ناراضی کا اظہار کیا گیا تھا اور مکہ معظمہ کی حرمت کے نام پر اس ارادہ و اقدام سے باز رہنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس رزولیشن کی تحریک یا تائید کرتے ہوئے حضرت مولانا مدنی نے ایک بڑی بسیط تقریر فرمائی تھی اور مکہ معظمہ کی حرمت اور وہاں ہر قسم کے جنگ و جدال کی دائمی ممانعت سے متعلق حدیثوں کے متن اس قدر کثرت سے پڑھ کر سنائے تھے کہ دینیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس وقت میرا یہ احساس تھا کہ شاید ان کو حدیث کے دفتر کے دفتر حفظ ہیں اور اس وسعت میں کوئی دوسرا عالم غالباً ان کا ہم پلہ نہ ہوگا ———
میرے لیے مولانا مرحوم کی زیارت اور تقریر سننے کا یہ دوسرا موقع تھا۔

اگلے سال میں پڑھنے کے لیے دارالعلوم دیوبند چلا گیا، وہاں دو سال قیام رہا۔ حضرت مولانا مدنی کا مستقل قیام اس زمانہ میں غالباً سلہٹ رہتا تھا لیکن دیوبند بار بار تشریف لانا ہوتا تھا، چنانچہ میرے دو سالہ قیام کے زمانہ میں کئی بار تشریف آوری ہوئی اور قریباً ہر دفعہ طلبہ اور مدرسین کے اصرار سے آپ نے تقریر بھی فرمائی، اس زمانہ کی آپ کی تقریریں معلومات سے معمور ہوتی تھیں خاص طور سے ہم طلباء ان سے بہت فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بعض تقریریں قلمبند بھی کی تھیں۔

جس سال میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوا اسی سال کے ختم پر کچھ ایسے واقعات دارالعلوم میں پیش آئے کہ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم چھوڑنے

کا فیصلہ فرمالیا، اس وقت دارالعلوم کی صدارت، تدریس کے لیے کوئی شخصیت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتی تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولانا نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا، چونکہ دارالعلوم میں میری طالب علمی کا دور حضرت مولانا کی تشریف آوری سے پہلے ختم ہو چکا تھا اس لیے مجھے باضابطہ تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گذشتہ ۳۰-۳۲ سال کی مدت میں دیوبند میں بھی اور باہر سفروں میں بھی خدمت میں حاضری اور رفاقت کی سعادت سیکڑوں بار حاصل ہوئی ——— حضرت مولانا کی زندگی کے جن پہلوؤں سے اپنی ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بناء پر میں زیادہ متاثر ہوا اس وقت بغیر کسی خاص ترتیب کے میں انھیں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

نماز کا امتیاز خالص دینی اعمال میں نماز سب سے زیادہ عام چیز ہے، اس لیے حضرت مولانا جیسی کسی عظیم دینی شخصیت کی نماز کا ذکر شاید بہت سے لوگوں کو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا ——— لیکن واقعہ یہ ہے کہ نماز کی حقیقت اگر کسی بندے کو نصیب ہو تو اس کو بندگی کا کمال نصیب ہوا اسی لیے نماز کو معراج المومنین کہا گیا ہے اور اسی لیے سیدنا حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اسلامی قلمرو کے تمام عمال یعنی صوبوں کے افسران اعلیٰ کے نام بھیجے جانے والے ایک مراسلہ میں سب سے پہلی بات یہ لکھی تھی کہ اِنَّ اَهَمَّ اُمُوْرِكُمْ عِنْدِي الصَّلٰوةُ (تمھارے کاموں میں سب سے زیادہ اہم .... اور دوسرے سب کاموں سے زیادہ اہتمام کی مستحق میرے نزدیک نماز ہے۔)

اصل بات یہ ہے کہ نماز صرف ایک دینی عمل ہی نہیں ہے بلکہ دینی نظام میں اس کا مقام وہ ہے جو انسان کے جسمانی نظام میں اس کے قلب اور روح کا مقام ہے۔ قلب کے بارے میں مشہور حدیث ہے کہ اسی کے صلاح و فساد پر پورے وجود انسانی کے صلاح و فساد کا مدار ہے۔ (اذا صلح صلح الجسد کلہ واذا فسد فسد الجسد کلہ) اسی طرح نماز کے بارے میں بعض حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کو جانچا جائے گا اگر بندہ کی نماز اچھی نکلی تو وہ کامیاب و بامراد ہوگا اور وہ ناقص و خراب نکلی تو وہ نامراد و خسارہ میں رہے گا اور بعض روایات میں اس طرح ہے کہ جس بندے کی نماز ٹھیک نکلے گی اس کے سارے عمل ٹھیک مانے جائیں گے اور جس کی نماز خراب ہوگی اس کے سارے عمل خراب قرار دیے جائیں گے۔

اسی قسم کی روایات کی بنا پر میں نے یہ کہا ہے کہ نماز کا مقام دینی نظام میں قلب و روح کا مقام ہے۔
نماز کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے یہ دعا نقل کی گئی ہے۔ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي (اے میرے رب مجھے ایسا کر دے کہ میں اچھی نماز ادا کرنے والا ہو جاؤں اور میری نسل میں سے بھی۔)

بہرحال اللہ کے کسی بندے کو نماز کی حقیقت اور اس کی روح کا نصیب ہونا اس کا سب سے بڑا کمال اور اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہے۔

نماز کی روح کیا ہے؟ —— اس کے جاننے کے لیے امام عارف حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ عبارت پڑھ لیجیے:- وروح الصلوٰۃ هی الحضور مع اللہ والاستشراف للجبروت وتذکر جلال اللہ مع تعظیم ممزوج بمحبۃ وطمانینۃ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۶۶ ج ۱) یعنی اللہ کے سامنے حضوری اور سکینت و محبت آمیز تعظیم کے ساتھ اس کے جلال و جبروت کا تصور اور گہرا دھیان بس یہی نماز کی روح ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے نماز کی جو روح بتائی ہے وہ بلاشبہ ایک باطنی حال ہے جس کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا لیکن جس طرح رنج و غم، فکر و الم، مسرت و شادمانی، لذت و سرور وغیرہ قلبی و باطنی کیفیات کے آثار کسی کے چہرے پر دیکھ کر یا اس کی گفتگو اور آواز میں ان کے اثرات محسوس کر کے ان اندرونی کیفیات کا اندازہ ہر ہوش و گوش والا کر لیتا ہے اسی طرح نماز کی اس روح کے آثار بھی دوسروں کے لیے بعض اوقات اتنے عیاں ہو جاتے ہیں کہ وہ گویا آنکھوں سے دیکھ لیتے اور کانوں سے سن لیتے ہیں۔ بعض صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بیان کیا ہے کہ نماز کی حالت میں ہم آپ کے سینۂ مبارک سے چکی چلنے کی سی یا بعض راویوں کے بیان کے مطابق ہانڈی میں جوش آنے کی سی ایک آواز سنتے تھے تو یہ دراصل اسی اندرونی کیفیت کا ایک اثر تھا جس کو دوسرے بھی محسوس کرتے تھے۔

اس تمہید کے بعد یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ حضرت مولانا مدنیؒ کے ساتھ اور قریب کھڑے ہو کر جب کبھی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ حضرت مولانا وہ نماز پڑھتے ہیں جو ہم کو نصیب نہیں

خاص کر جب مولانا فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے تو بعض اوقات تو خطرہ ہونے لگتا کہ کہیں قلب نہ پھٹ جائے۔

ادھر کئی سال سے حضرت کے گھٹنوں میں مستقل تکلیف رہتی تھی جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا، خاص کر سجدے میں جانا اور سجدے سے کھڑا ہونا بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کا بھی دل دکھتا تھا لیکن اس تمام عرصہ میں فرائض ہی نہیں بلکہ اوّابین اور تہجد وغیرہ نوافل بھی ہمیشہ کے معمول کے مطابق طولِ قرائت اور طولِ قیام ہی کے ساتھ ادا فرماتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ جس حالت کو ہم سخت تکلیف و مشقت سمجھ رہے ہیں ان کے لیے اسی میں راحت و لذت ہے ظاہر ہے کہ یہ حال اسی بندے کا ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اور "یا بلال ارحنی بالصلوٰۃ" والی کیفیت سے خاص حصہ ملا ہو۔

رسول اللہ صلعم کی محبت اور اتباع سنت

حدیث میں حقیقت ایمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے وابستہ بتلایا گیا ہے فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور خود اپنی ذات سے بھی زیادہ رسول اللہ صلعم سے محبت نہ ہو، اس کو حقیقت ایمان نصیب نہیں ہے اور حضور کی اس محبت کا لازمی نتیجہ آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کی عظمت و محبت اور آپ کی سنتوں اور عادات و اطوار کے اتباع کا اہتمام اور شغف ہے۔

اس عاجز نے اس باب میں حضرت مولانا کو بہت ممتاز پایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ نسبت رکھنے والی ہر چیز کے ساتھ حتیٰ کہ مدینہ طیبہ کی مٹی کے ساتھ حضرت مولانا کو جو خاص قلبی تعلق تھا جس کا اظہار اپنے موقع پر عملی زندگی میں قدرتی طور پر ہوتا رہتا تھا اس کی مثال اس عاجز نے دوسری جگہ نہیں دیکھی۔

اسی طرح اتباع سنت کا اہتمام اور شغف عبادات ہی میں نہیں بلکہ امور معاشرت اور عادات میں بھی جس قدر فرماتے تھے تلاش کرنے والے کو اس کی مثالیں خواص اہل دین میں بھی شاذ و نادر ہی ملیں گی اس سلسلہ میں بعض عادات اور روزمرہ کی بعض ایسی باتوں کا ذکر کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا جن سے اندازہ ہو سکے کہ سنن نبویہ کا اتباع گویا آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

مثلاً تکیہ چمڑے کا استعمال فرماتے تھے، کھانا کھاتے وقت نشست ہمیشہ سنت کے مطابق ہوتی تھی۔ اپنے دسترخوان پر (جو عام طور پر گول ہوتا اور جس پر دس بارہ آدمی آپ کے ساتھ دائرہ بنا کر بیٹھتے) سالن ایک ہی بڑے برتن میں ہوتا اور سب کے ہاتھ اسی ایک برتن میں پڑتے حتیٰ کہ اگر کہیں دعوت میں شرکت فرماتے اور وہاں آج کل کے رواج کے مطابق ہر شخص کے کھانے کی پلیٹ الگ ہوتی تو اپنے قریب والوں کو اپنے ساتھ شامل فرما کر وہاں بھی مسنون طریقہ پر ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا تناول فرماتے۔ اسی طرح اُٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے سونے میں حتیٰ کہ لباس اور جوتا پہننے میں بھی طریقہ سنت کی پابندی فرماتے۔ اگر آپ کے تشریف لانے پر آپ کے نیازمند اور خدام تعظیماً کھڑے ہو جاتے (جیسا کہ آج کل کا عام دستور ہے) تو ناراضگی کا اظہار فرماتے بلکہ بعض اوقات اس اظہار ناراضگی میں برافروختگی بھی ہوتی۔ اور فرماتے کہ آپ لوگ کیوں کھڑے ہوئے کیا آپ معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کھڑے ہونے سے ناگواری ہوتی تھی۔

یہ روزمرہ کی چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرت اور عادات میں بھی سنن نبویہ کا اتباع آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

حد سے زیادہ تواضع اور خاکساری

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت مولانا کا جو مقام ہو گا اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن جو لوگ ان کے احوال سے کچھ بھی واقف ہیں وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں کسی عالم دین اور کسی روحانی پیشوا کو جو بڑی سے بڑی عظمت و وجاہت، بلندی و برتری حاصل ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ مولانا کو حاصل تھی۔ دارالعلوم دیوبند جیسی باعظمت دینی درسگاہ کے وہ صدر اور شیخ تھے۔ ہزاروں عالم (جو اپنی اپنی جگہ اپنے حالات کے مطابق کسی نہ کسی دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں کے خاصے وسیع و عریض حلقے ہیں) ان کے شاگرد اور فدائی، ہندوستان کے طول و عرض میں لاکھوں مریدین، پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی عظیم قربانیوں کے طفیل ملک کے اہل حکومت و سیاست کی نگاہ میں بھی ان کا خاص مقام اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدہ داروں کی نگاہ میں ان کا غیر معمولی احترام — ان ساری عظمتوں اور بلندیوں کے باوجود ان میں تواضع اور انکسار اس قدر تھا کہ جن لوگوں کو قریب رہنے اور برتنے کا موقع نہ ملا ہو وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتے بلکہ یہ عاجز اس موقع

پر صفائی کے ساتھ یہ ظاہر کر دینا ہی مناسب سمجھتا ہے کہ بعض اوقات راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا اتنا تواضع شاید دوسروں کے لیے مضر ہو ـــــ اس سلسلے میں بھی خود اپنے ساتھ گذرے ہوئے بعض واقعات کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۱۳۴۳ھ کی بات ہے میری طالب علمی ہی کا زمانہ تھا۔ ہمارے وطن سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" کی طرف سے خاصے بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ہوا اس میں جماعت دیوبند کے اس وقت کے اکثر اکابر علماء (مثلاً حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندیؒ) نے شرکت فرمائی تھی، حضرت مولانا مدنی بھی تشریف لائے تھے۔ مدرسہ کے مہتمم اور جلسے کی منتظمین کی اجازت سے ایک دن دوپہر کے وقت کے کھانے کا انتظام میرے والد ماجدؒ نے اپنے یہاں کیا تھا جلسہ گاہ اور ان حضرات کی قیام گاہ سے ہمارے مکان کا فاصلہ ایک میل سے کچھ زیادہ تھا اس لیے سب مہمانوں کو سواری کے ذریعہ لانے کا انتظام کیا گیا تھا اور سب حضرات سواری ہی سے آئے لیکن حضرت مولانا مدنی نے یہ کیا کہ سنبھل کے اپنے ایک پرانے شاگرد اور نیازمند کو بطور راہ نما ساتھ لے کر خاموشی سے ہمارے گھر پیدل تشریف لائے حالانکہ موسم گرم تھا اور بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا فاصلہ میل بھر سے بھی زیادہ تھا۔

سنبھل کے اسی سفر میں ہمارے یہاں کے ایک صاحب نے جو بیچارے علمی، دینی، دنیوی کوئی بھی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے اور حضرت مولانا سے ان کا کوئی تعارف بھی نہیں تھا حضرت مولانا مدنی سے درخواست کی کہ میرے گھر پر چل کر چائے پی لیجیے، مجھے یاد ہے کہ ان کی یہ بات سب کو کچھ عجیب سی معلوم ہوئی، لیکن مولانا نے بغیر کسی عذر و معذرت کے قبول فرما لیا اور ان کے ساتھ ان کے گھر پر جا کر بالکل بے وقت چائے اور صرف چائے پی لی۔

ایک عجیب واقعہ اور سنیئے ـــــ حضرت کے ایک شاگرد نے خود اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت ریل سے سفر فرما رہے تھے اور یہ صاحب خادم کی حیثیت سے حضرت کے ساتھ تھے انھیں استنجا کا تقاضہ ہوا بیت الخلا کا دروازہ کھولا تو اس کو بہت غلیظ اور گندہ دیکھ کر واپس آ گئے اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور بیت الخلاء میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا، چند منٹ کے بعد تشریف لائے اور اپنے ان خادم سے کہا

کہ اب چلے جاؤ انہوں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت ان کی واپسی کی وجہ محسوس کر کے بیت الخلا صاف کرنے ہی کے لیے اندر تشریف لے گئے تھے اور جب لوٹے بھر بھر کے بہت سا پانی بہا دیا اور اس کو صاف کر دیا تو باہر تشریف لائے ـــــ کچھ حد ہے اس تواضع اور بے نفسی کی؟

کئی سال پہلے کی بات ہے حضرت کے ضعف پیری اور بعض دوسری اہم مصلحتوں کی بنا پر حضرت کے چند نیازمندوں نے (جن میں یہ عاجز بھی شامل تھا) باہم مشورہ کر کے ایک دفعہ حضرت سے عرض کیا کہ حضرت اب صرف وہ سفر فرمایا کریں جس کی کوئی خاص ضرورت اور اہمیت ہو اور یہ جو ہو رہا ہے کہ لوگ معمولی معمولی مقامی ضرورتوں اور جلسوں کے لیے حضرت کو تکلیف دیتے ہیں اور حضرت قبول فرما لیتے ہیں (اور اسی طرح ہر ہفتے میں جمعہ کے ایک دن کا سفر تو ضروری ہوتا ہے) یہ سلسلہ اب بند فرما دیا جائے، حضرت نے فرمایا میں کیا کروں لوگ آ جاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں عرض کیا گیا کہ اگر حضرت طے فرما لیں کہ اس سلسلہ کو بند کرنا ہے تو تھوڑے عرصہ تک تو ایسا ہوگا کہ لوگ آئیں گے اور حضرت کے انکار فرما دینے پر مایوس واپس چلے جائیں گے۔ اس کے بعد عام طور سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت نے اب یہ فیصلہ فرما لیا ہے تو پھر اس غرض سے لوگ آیا بھی نہیں کریں گے۔ فرمایا مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے بندے آئیں اور وہ کہیں چلنے کے لیے اصرار کریں اور میں انکار پر جما رہوں، عرض کیا گیا کہ حضرت کی صحت اور حضرت کا وقت بہت قیمتی ہے اس کو صرف ضرورت اور موقعے ہی پر صرف ہونا چاہیے، حضرت نے خاکساری اور تواضع میں ڈوبے ہوئے لہجے میں فرمایا آپ لوگ یہ کیا کہتے ہیں میں کیا ہوں اور میری کیا قیمت ہے یہ مٹی کا جسم ہے جب تک چل رہا ہے اس سے کام لے لینا چاہیے۔

عزیمت یا شدت فی امر اللہ حضرت مولانا میں جہاں تواضع اور خاکساری اس درجہ کی تھی جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر ہوا وہیں بظاہر اس کے بالکل برعکس یہ بات بھی تھی کہ جس راستے پر چلنے کو وہ حق سمجھ لیتے پھر کسی کا کہنا سننا، کسی کا ساتھ دینا یا ساتھ نہ دینا، کسی کی رضامندی یا ناراضگی کسی کی تحسین یا ملامت، حتیٰ کہ کوئی زلزلہ اور بھونچال بھی ان کو اس راستہ سے ہٹا نہیں سکتا تھا ـــــ اس کی سب سے روشن مثال ان کا سیاسی مسلک اور اس سلسلہ کی ان کی سرگرمیاں ہیں۔

ہندوستانی سیاسیات کے بارہ میں ایک رویہ کو صحیح سمجھ کر انھوں نے اپنا لیا تھا ، جو لوگ دس بارہ سال پہلے کے واقعات بھولے نہیں ہیں انھیں یاد ہو گا کہ مولانا کو اس راہ میں کیسے کیسے ناموافق حالات اور کتنے سخت طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور عزت و آبرو تک کی کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس دور میں جتنی زیادہ مخالفت بڑھی حضرت مولانا کو اس زمانہ میں اتنا ہی زیادہ مضبوط غیر متزلزل اور پر جوش پایا گیا۔

اس سیاسی میدان میں حضرت مولانا کے ساتھ علماء اور غیر علماء میں اور بھی بہت سے تھے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت مولانا کی شان اس معاملہ میں بالکل نرالی تھی وہ جب کسی نجی مجلس میں بھی اس موضوع پر بات کرتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنے راستے کا ایسا یقین ہے اور وہ اتنے یکسو ہیں کہ دوسرے پہلو کو سننے اور سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اور یہ کہ اس مسئلہ کا تعلق ان کے دماغ سے کہیں زیادہ ان کے قلب اور ان کی روح سے ہے۔ یہ میں نے ایک ایسے مسئلہ کی مثال دی ہے جس میں حضرت مولانا کی عزیمت اور شدت کا تجربہ قریب قریب پورے اسلامی ہند نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی بہت سی ایسی مثالیں یاد ہیں کہ حضرت مولانا نے جس چیز کو حق اور جس رویہ کو اپنے لیے صحیح سمجھ لیا پھر ان کے خاص معتمد اور نیاز مند بھی ان کا رویہ بدلوانے اور رخ موڑنے کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے، الّا یہ کہ رائے ہی میں کوئی تبدیلی ہو جائے —— یہاں صفائی سے یہ بھی عرض کر دینے کا جی چاہتا ہے کہ ایسی ناکامی کا تجربہ ایک سے زیادہ دفعہ خود راقم سطور کو بھی ہوا ہے۔

ایثار و فیاضی اور مہماں نوازی

ناظرین نے ایثار و فیاضی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے خود اس عاجز نے بھی دیکھے ہیں لیکن حضرت مولانا کی ذات میں اس کا جو نمونہ دیکھا اس کی مثالیں تو پچھلی تاریخ کی کتابوں میں بھی بہت کم ہی مل سکیں گی۔

مولانا کا دولت خانہ ایک ایسا وسیع مسافر خانہ یا مہمان خانہ تھا کہ جن لوگوں کو خود کبھی مولانا کا مہمان بننے کا اتفاق نہیں ہوا وہ کسی دوسرے سے اس کا حال سن کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتے —— بیسوں دفعہ کے اپنے مشاہدے اور تجربہ کی بنا پر میرا محتاط اندازہ ہے کہ برسہا برس سے مولانا کے یہاں مہمانوں کا اوسط چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ رہتا تھا، ان میں ایک

خاصی تعداد تو ان اہل طلب کی ہوتی تھی جو حضرت سے بیعت ہونے کے لیے دور قریب کے مختلف مقامات سے روزانہ آتے تھے ان کے علاوہ ایک تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو صرف زیارت و ملاقات کے لیے یا کسی معاملہ میں دُعا کی درخواست کے لیے یا اپنی کسی ضرورت میں حضرت مولانا کی سفارش حاصل کرنے کے لیے یا ایسے ہی کسی اور کام سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور ایک دو دن رہ کر واپس چلے جاتے تھے، ان کے علاوہ کچھ حضرات وہ بھی ہوتے تھے، جو ذکر و شغل اور روحانی تربیت کے لیے، کئی کئی مہینے حضرت کی خدمت میں مقیم رہتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ مہمانوں کی ان قسموں کے علاوہ کچھ لوگ حضرت مولانا کی اس فیاضی اور مہمان نوازی سے بے جا فائدہ اُٹھانے والے بھی ہوتے تھے، میں نے واقفین سے سنا ہے کہ قرب و جوار کے دیہات کے بعض لوگ جو بازار، تھانے یا تحصیل کے اپنے کاموں سے دیوبند آتے تھے وہ بھی کھانے کے وقت حضرت کے مہمان بن جاتے تھے اور حضرت ان کی اس نوعیت سے واقف ہونے کے باوجود ان کی مہمان نوازی کرتے تھے بلکہ خادموں تک کو سخت تاکید تھی کہ اگر کسی کے متعلق ایسا اندازہ ہو تب بھی مہمانوں ہی کی طرح اس کا اکرام کیا جائے ——— مجھے حضرت کے ایک خادم نے خود بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے ایسے ایک صاحب سے کچھ کہہ دیا تو حضرت ان پر سخت غصہ ہوئے اور یہاں تک فرمایا کہ میرے یہاں آنے والے کسی بھی مہمان کا جو شخص دل دکھائے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا

بہرحال مختلف انواع و اقسام کے ان مہمانوں کی تعداد کا اوسط جیسا کہ اس ناچیز نے عرض کیا چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ تھا اگر کبھی صرف تیس پینتیس ہوتے تھے تو اسی طرح کبھی ساٹھ ستر تک بھی ہو جاتے تھے۔

حضرت مولانا دونوں وقت مہمانوں کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور سب مہمان وہی کھاتے تھے جو خود حضرت کھاتے تھے۔

اگر کسی مخصوص مہمان کے اکرام میں کوئی خاص اہتمام اور تکلف کیا جاتا مثلاً پلاؤ یا بکیت یا زردہ تیار کیا جاتا، یا دیوبند کی مشہور فیرنی آتی تو بلا امتیاز سارے مہمان اس دن وہی کھانا کھاتے اور میرا خیال ہے کہ ہفتے میں ایک دو دفعہ ایسا ضرور ہوتا تھا۔

یہاں اس چیز کا ذکر کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت کے یہاں کا روزمرہ کا سادہ کھانا بھی (یعنی روٹی اور آلو یا لوکی جیسی کسی ترکاری کے ساتھ بڑے گوشت کا شوربہ والا سالن) اس قدر لذیذ اور ذائقہ دار ہوتا تھا کہ میں خود بھی شہادت دے سکتا ہوں اور بہت سے مہمانوں سے بھی میں نے سُنا ہے کہ حضرت کے دسترخوان پر بیٹھ کر سوایا یا ڈیوڑھا کھانا کھایا جاتا ہے اور کبھی نقصان نہیں دیتا ــــ جو لوگ حضرت کے حالات سے کچھ باخبر ہیں اور جنھوں نے حضرت کی عجیب وغریب اور بے مثال مہمان نوازی کا تجربہ کیا ہے ان کو اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ روزمرہ کی اس مہمان نوازی اور اسی طرح کی بعض دوسری ملکی مدوں میں حضرت کے ہاتھوں سے جو کچھ دوسروں پر خرچ ہوتا تھا، خود اپنی ذات پر اور اہل وعیال پر اس کا چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوتا ہوگا۔

کسی بندے کے ظاہری احوال واعمال سے اس کے اندرونی حال کے بارے میں جہاں تک رائے قائم کرنے کا حق ہے اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شح اور حبِ مال سے حضرت کے قلب وروح کو ایسا صاف کر دیا تھا کہ شاید اس کے غبار کا کوئی ذرہ بھی وہاں نہیں رہا تھا اور ان شاء اللہ حضرت مولانا اس قرآنی بشارت کے خاص مستحقین میں ہوں گے۔

وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ــــ (تغابن)

اور اللہ نے اپنے جن بندوں کو شح اور حب مال کی بیماری سے بچا لیا وہ یقیناً فلاح پانے والے ہیں۔

ایک واقعہ اس جگہ اور بھی سُن لیجیے جس سے حضرت مولانا کی اس خصوصیت (یعنی ایثار و فیاضی اور دوسروں کی راحت رسانی کا فکر واہتمام) کے علاوہ ایسی ہی بعض اور خصوصیات بھی آپ کو معلوم ہوں گی۔

غالباً ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء کی بات ہے، سوامی شردھانند کی اٹھائی ہوئی شدھی سنگٹھن کی تحریک کے مقابلے میں "جمعیۃ العلماء ہند" کا شعبۂ تبلیغ میدان میں اُترا ہوا تھا۔ اُس وقت اس کے سامنے تبلیغی وفود کے ذریعہ وقتی دفاعی کوششوں کے علاوہ اُن علاقوں میں جو شدھی تحریک کا خاص میدان بنے ہوئے تھے، مذہبی مکاتب قائم کرنے کا ایک ٹھوس مستقل اور وسیع کام بھی تھا، جس کے لیے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی ــــ جمعیۃ العلماء ہند اور اکابر دیوبند سے تعلق رکھنے والے رنگون کے صاحبِ خیر تاجروں نے اس سلسلہ میں مالی امداد کا ایک منصوبہ

تیار کیا اور جمعیۃ العلماء ہند سے اپنا ایک وفد برما بھیجنے کی درخواست کی، اس وقت برما ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا ـــــ یہ وفد رنگون پہونچا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد سعید صاحب (جو اس وقت جمعیۃ کے ناظم تھے) اس وفد کے ارکان تھے ـــــ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم بھی اس وفد کے ساتھ تھے، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اہلِ رنگون ہی کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے تشریف لے گئے تھے۔ (شدھی سنگٹھن کے مقابلہ میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے یہی مستقل کام ہو رہا تھا)

بہرحال یہ تینوں حضرات رنگون پہنچے ـــــ صوبہ برما کے اس وقت کے انگریز گورنر نے یا اس کی ہدایت پر اس کے ماتحت کسی انگریز حاکم نے یہ حماقت کی کہ رنگون کے جن سورتی تاجروں نے ان حضرات کو دعوت دے کر بلایا تھا اور جو اس سلسلہ میں پیش پیش تھے، ان کو بلا کر اس نے کہا کہ آپ کے یہاں جو یہ تین عالم لوگ آئے ہیں ان میں ایک آدمی مولانا حسین احمد بہت خطرناک ہیں اور گورنمنٹ کے دشمن ہیں اس لیے ان کو ہم یہاں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ وفد ایک بالکل دوسرے مقصد سے آیا ہے اس لیے اس کا کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی گورنمنٹ کے خلاف تقریر کرے لیکن اس نے کہا، ہمیں معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں اس لیے ان کو تقریر کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بالآخر ان سورتی تاجروں نے (جو گورنمنٹ کی نگاہ میں بھی خاص وقار رکھتے تھے) اس کی ذمہ داری لی کہ کوئی تقریر گورنمنٹ کے خلاف نہیں ہوگی، تب اس نے اجازت دی۔ ان بیچاروں نے یہ ساری بات حضرت کے سامنے بھی ذکر کر دی، حضرت نے فرمایا آپ نے اچھا نہیں کیا کہ مجھ سے دریافت کیے بغیر وعدہ کر آئے۔ یہ صحیح ہے کہ گورنمنٹ کے متعلق کچھ کہنے کا اس وقت میرا ارادہ نہیں تھا، لیکن اب مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تقریر کروں اور گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں، لہٰذا آپ حضرات کے لیے اب یہی بہتر ہے کہ میں تقریر نہ کروں، اور واپس چلا جاؤں لیکن رنگون کے وہ حضرات کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے، آخر میں انھوں نے عرض کی کہ آج حضرت کی تقریر تو ضرور ہوگی اور جو حضرت کا جی چاہے وہی فرمائیں پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا ـــــ لیکن حضرت مولانا اس خیال سے کہ کہیں یہ بے چارے

مشکلات میں مبتلا نہ ہوں برابر انکار فرماتے رہے، آخر میں حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے بھی ان کی سفارش کی تو بڑی مشکل سے حضرت اس بات پر راضی ہوئے کہ آج تقریر فرماویں گے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ اس کے بعد کوئی تقریر نہیں کروں گا اور پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤں گا، حضرت مولانا نے (انھیں کی خیر خواہی کے لیے) اس شرط پر اتنا اصرار کیا کہ ان لوگوں کو بادلِ ناخواستہ ماننا پڑا ـــــ وقت آنے پر جلسہ شروع ہوا حضرت مولانا نے خطبۂ مسنونہ اور چند تمہیدی الفاظ کے بعد تقریر اس طرح شروع فرمائی، کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے گورنر صاحب نے ہمارے محترم میزبانوں سے میرے بارے میں خطرہ کا اظہار کر کے میری تقریر کو روکنا چاہا تھا، اور یہ حضرات اپنی سادگی سے یہ وعدہ کر آئے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا، مجھے ان کے اس وعدے کا افسوس ہے لیکن بہر حال اب مجھے ان کے وعدے کی لاج رکھنی ہے، اگر وہ یہ وعدہ نہ کر آتے تو میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ مجھے کیوں خطرناک سمجھتی ہے اور مجھے گورنمنٹ سے کیا شکایت ہے، میں بتاتا کہ گورنمنٹ نے پوری اسلامی دنیا کو اور ہمارے ملک ہندوستان کو اور ہم ہندوستانیوں کو کتنا تباہ و برباد کیا ہے ـــــ بیان کرنے والے کا بیان ہے ـــــ کہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مولانا یہی بیان فرماتے رہے کہ اگر ہمارے میزبان وعدہ نہ کر آتے تو میں یہ بتاتا اور یہ بتاتا ـــــ آخر میں فرمایا کہ چونکہ ہمارے محترم میزبانوں نے گورنر صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا اس لیے میں مجبور ہو گیا ہوں اور میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہتا ـــــ پھر چند کلمات وفد کے مقصد کے متعلق بھی کہکر تقریر ختم فرمائی۔

حضرت مولانا اپنی شرط کے مطابق غالباً دوسرے یا تیسرے ہی دن بحری جہاز سے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ حاجی داؤد ہاشم مرحوم نے (جو وفد کے خاص داعی اور میزبان تھے) اپنے خاص ملازم محمد ذاکر صاحب کو بطور خادم کے کلکتہ تک کے لیے حضرت کے ساتھ کر دیا۔ حضرت کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا اور ذاکر صاحب کا ٹکٹ سرونٹ کی حیثیت سے تھرڈ کا تھا۔ حضرت مولانا کی سیٹ جس کمرہ میں تھی اس میں کوئی دوسرا مسافر نہ تھا اس لیے حضرت چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب بھی زیادہ سے زیادہ وقت وہیں حضرت کے ساتھ رہیں، لیکن جہاز کا "بولئے" جب آتا تو ذاکر صاحب کے ہر وقت وہاں رہنے پر معترض ہوتا، اس لیے حضرت مولانا نے یہ کیا کہ

وہ خود زیادہ وقت تھرڈ کلاس میں ذاکر صاحب کے ساتھ گذارنے لگے۔ بہرحال سفر ختم ہوا اور چوتھے دن کلکتہ کا ساحل آگیا۔ رواج کے مطابق "بوائے" فرسٹ کلاس کے مسافروں سے "انعام" یا "بخشش" مانگنے آیا۔ اگرچہ راستے میں اس نے حضرت مولانا کو تکلیف دی تھی لیکن "انعام" مانگنے کے لیے وہ حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، ذاکر صاحب بھی اس وقت ساتھ تھے، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہم لوگوں کو بہت تکلیف دی ہے اسے ایک پیسہ نہ دیجیے لیکن مولانا نے ہنس کے فرمایا کہ نہیں ان کا حق ان کو ضرور دیا جائے گا ——— (آگے کی بات سننے سے پہلے یہ ذہن میں رکھ لیا جائے کہ یہ قصہ اس وقت کا ہے جب کہ ایک روپیہ آج کے ۱۰۰ روپے کے برابر تھا اس لیے جو لوگ بڑے سے بڑا انعام بھی بوائے کو دیتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ ہوتا تھا) ——— اس کے بعد سنیے کہ مولانا نے گن کر چار روپے نکالے اور اس کو دینے لگے وہ سمجھا کہ یہ مجھ سے مذاق کرتے ہیں اور اس طرح میری بدسلوکی کا انتقام لینا چاہتے ہیں اس لیے اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا، حضرت مولانا نے فرمایا، لے لو یہ تمھارے ہی لیے ہیں، آخر بہت جھجکتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت نے وہ روپے اس کو دے دیے ——— راقم سطور عرض کرتا ہے کہ خود محمد ذاکر صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اس کم بخت نے تو حضرت کو اتنی تکلیف دی کہ خدمت کے لیے مجھے حضرت کے ساتھ بھی نہ رہنے دیا اور حضرت نے اسے اکٹھے چار روپے دے دیے، بڑے سے بڑا انگریز بھی ان لوگوں کو ایک روپیہ سے زیادہ نہیں دیتا۔ حضرت نے فرمایا، بھائی ذاکر اصل بات یہ ہے کہ یہ بے چارہ سمجھتا تھا کہ انعام بس صاحب بہادروں سے ملتا ہے، ہماری صورتوں سے اُسے کچھ ملنے کی امید نہیں تھی اس لیے اس نے ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کیا، اب ہمارا سفر تو ختم ہو گیا میں نے یہ روپے اسے اس لیے دیے ہیں کہ اُسے معلوم ہو کہ ہم جیسے لوگ انگریزوں سے زائد دے سکتے ہیں، اب مجھے اُمید ہے کہ ہماری ایسی صورت والے اللہ کے کسی بندے کو انشاء اللہ یہ آیندہ نہیں ستائے گا بلکہ ان کو آرام پہونچانے کی کوشش کرے گا۔

اسی ایک واقعہ سے حضرت کی عالی ظرفی اور مزاج ایمانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ———

عنداللہ مقبولیت کی ایک خاص نشانی

بعض حدیثوں میں اللہ کے خاص مقبول بندوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ انھیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہے ــــ اس یاد کے لیے جس ایمانی مناسبت اور جس توفیق کی ضرورت ہے جو لوگ اس سے محروم ہیں ان کا تو ذکر نہیں لیکن جن کو اللہ نے اس خیر سے محروم نہیں کیا ہے ان میں سے جس کو بھی حضرت سے قریب ہونے اور خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہوگا، یقین ہے کہ اس کو اس کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا کہ ان کے پاس بیٹھ کر یا ان کو دیکھ کر دل میں خدا کی یاد اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی تھی ــــ خود اپنے بارے میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ بہت سے امور میں میری رائے حضرت سے متفق نہیں ہوتی تھی اور رائے میں خاصا بعد ہوتا لیکن جب خدمت میں حاضری ہوتی تو یقین تازہ ہو جاتا کہ یہ اللہ کے خاص الخاص بندوں میں سے ہیں اور مجھ جیسوں کے لیے ان کی جوتیاں صاف کرنا اور قدموں کا غبار جھاڑنا بھی سعادت ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی روح پر رحمتیں نازل فرمائے اور اُن کے ان ایمانی اوصاف کے حصہ سے ہم کو محروم نہ رکھے۔

عتیق الرحمن سنبھلی

ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ

(شمارہ بابت ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ میں شائع ہوا)

محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کے برادر معظم جناب ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبد العلیؒ کی وفات کی خبر ناظرین الفرقان کو بھی مل چکی ہوگی۔ خدا غریق رحمت کرے! ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی ذات اور اپنے اوصاف و کمالات کے اعتبار سے ایک نادرۂ روزگار ہستی تھے۔ وہ اس خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے سید احمد شہیدؒ جیسی ناقابل فراموش ہستی ملت کو بخشی، اور اپنے بزرگوں کے امتیازات و کمالات کے جامع بھی۔

اس فرشتہ صفت ہستی کو ۴۳ء سے لے کر عین اس لمحہ تک جب اس کی پاک روح نے اپنے مالک کی طلبی پر لبیک کہتے ہوئے پرواز کی، مسلسل اور بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ الفرقان کا دفتر شروع میں تو ۸۔۹ سال تک گویا ڈاکٹر صاحب کے مطب اور دولت کدہ سے بالکل متصل ہی رہا۔ اس کے بعد جو کچھ فاصلہ بڑھا بھی تو وہ چند قدم سے زیادہ کا نہ تھا۔ رہائشی مکان بھی ۵۔۶ سال تک ڈاکٹر صاحب کے زیر سایہ ہی ملا۔ اٹھنا بیٹھنا لکھنؤ کے قیام کے روز اول ہی سے ڈاکٹر صاحب کے متعلقین کے ساتھ رہا۔ اس طرح اپنی بد قسمتی سے گو حاصل کچھ نہیں کیا، لیکن خوش قسمتی سے دیکھا بہت کچھ اور جو کچھ دیکھا وہ کبھی بھولنے والا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی صورت ہی دیکھ کر آدمی کو انس اور عقیدت پیدا ہوتی تھی۔ یہ دراصل ان کے باطن کی نورانیت اور جاذبیت کا عکس تھا جو پوری آب و تاب کے ساتھ اُن کے چہرے پر نمایاں رہتا تھا۔ اہل تقویٰ آج بھی اس دنیا میں بہت سے ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ لیکن

ڈاکٹر صاحب کو بہت تھوڑی ہی مدت قریب سے دیکھنے کے بعد دل گواہی دیتا تھا کہ معاصی سے پرہیز کرنا تو الگ بات ہے، ان کے دل میں معصیت کا تصور کبھی شاید نہیں آتا۔ وصال کے چند دن بعد ڈاکٹر صاحب کے رفیق خاص و دم ساز حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی (اطال اللہ بقائہ) کی خدمت میں اس درخواست کے لیے حاضری ہوئی کہ آپ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو جتنا جانتے ہیں شاید ہی کوئی دوسرا اس درجہ کی واقفیت رکھتا ہو۔ لہذا جی چاہتا ہے کہ اگر صحت مساعد ہو تو مرحوم کے تذکرے میں کچھ ارقام فرمائیں، بہت سے بندگانِ خدا کو اس سے دینی فائدہ پہونچے گا۔ اس صحبت میں ڈاکٹر صاحب کی سیرت کے اس پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کا ذکر میں نے چھیڑا ہے مولانا موصوف نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تأثر نقل فرمایا کہ ایک مرتبہ حیدرآباد کے زمانہ قیام میں میری ہی تحریک پر علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کا علاج شروع ہوا۔ یہ پہلی ملاقات تھی جو کافی ممتد ہوئی۔ واپس ہو کر مجھ سے کہا کہ میاں میں تمھارا شکر گزار ہوں کہ ایک ایسے آدمی کے دیکھنے کا موقع تم نے میرے لیے فراہم کیا جیسا نہ اب تک ان آنکھوں نے دیکھا ہے اور نہ امید ہے کہ دوسرا دیکھنے میں آئے۔ میرا تو دل پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ اس شخص کے قلب پر کسی معصیت کا خطرہ بھی نہیں گزرتا!

یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو تھوڑی ہی سی مدت قریب سے دیکھنے کے بعد پورے جزم و وثوق کے ساتھ یہ تاثر طاری ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی درجہ کی بھی معصیت کا مادہ ہی اس انسان کے اندر نہیں رکھا ہے۔ کوئی تارک الدنیا قسم کے انسان نہیں تھے۔ مطب کرتے تھے زمین اور باغات کے علائق رکھتے تھے۔ ایک وسیع کنبے کے ذمہ دار تھے۔ ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داریاں تھیں، غرض ہر طرح کے بشری علائق تھے۔ مگر قول و عمل میں وہ پاکیزگی، وہ طہارت وہ معصومیت کہ فرشتے بلائیں لیں۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسی طرح کا ایک امتیازی وصف جسے مذکورہ بالا انبیائی وصف کا شاخسانہ کہنا بجا ہوگا اُن کی للّٰہیت اور استحضارِ عبدیت تھا۔ ان کے اس باطنی کمال کے یقین سے دل معمور تو تھا ہی مگر مرحوم کا وہ خط دیکھ کر جو عین جوانی کی عمر میں انھوں نے اپنے والد ماجد

حضرت مولانا حکیم عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا تھا، یہ یقین حق الیقین سے بدل گیا۔ اللہ اللہ کیا ٹھکانہ ہے اس للّٰہیت اور استحضار عبدیت کا کہ الہ آباد یونی ورسٹی سے بی ایس سی کر کے نکلے ہیں اور اپنی آئندہ زندگی کے نقشے کے خطوط تیار کرتے ہوئے والد ماجد کو لکھتے ہیں۔

صرف عصیاں ہوا وہ حصۂ عمر
جو تری یاد میں بسر نہ ہوا

جس کی جوانی میں للّٰہیت اور عبدیت کا یہ رنگ ہو، کیا پوچھنا ہے اس کی پختہ سنی اور بڑھاپے کے رنگ کا۔ بس للّٰہیت وعبدیت کی ایک موہنی تصویر تھی جو نہ جانے کب تک آنکھوں میں پھرتی رہے گی۔

اتباعِ سنت میں بھی اپنے بزرگوں کا پورا پورا ورثہ پایا تھا...... سنت اور سنت کے قائم کردہ حدود کی پابندی ہر چیز میں عزیز تھی۔ انگریزی تعلیم اور ڈاکٹری کے پیشے میں کامیابی کے باوجود وضع قطع، رہن سہن اور گھر کا چال چلن از اول تا آخر سنت کے حدود کا پابند۔ ہر طرف ایک دلآویز مسنون سادگی، تکلفات سے دوری، سنت اور حدودِ سنت ہی نہیں، مذاقِ سنت کی بھی ایسی پاسداری تھی کہ انسانی کمزوری کے نہایت نازک مواقع پر بھی اس میں فرق نہیں آتا تھا۔ پانچ صاحب زادیوں پر اکلوتے صاحب زادے، سب سے چھوٹے اور فطری سعادت کی بنا پر صحیح معنیٰ میں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، لیکن لکھنؤ کے پرتکلف اور گراں بار رواجوں سے جکڑے ہوئے ماحول میں اس شان سے شادی کی تقریب ادا ہوئی کہ جیسے سارا ارمان یہی تھا کہ سنت کے مذاقِ سادگی کی پیروی کا ایک یہ موقع بھی میسر آئے۔ بڑا دل گردہ چاہیے ایسے فطری کمزوریوں کے مواقع پر بھی مذاقِ سنت کو عزیز رکھنے میں!

لڑکیوں کے رشتے آج کی ایک عام کمزوری ہیں اچھے اچھے دیندار اور ناصحان انبیاء لڑکیوں کے دنیاوی عیش و آرام کی خاطر ان کے رشتے میں دینداری کی تلاش کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں راقم نے اپنی محدود نظر سے ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ ہی کو دیکھا کہ دنیاوی تعلیم دنیاوی وجاہت، دینی عزت اور عالی نسبی کا جامع ہوتے ہوئے پانچوں صاحبزادیوں کے رشتوں

ہیں ایک نگاہِ غلط انداز بھی ان مواقع پر نہیں ڈالی جو ان معزز حیثیات کا جامع ہونے کی بدولت دنیاوی اعتبار سے اچھے رشتوں کے حصول میں انھیں حاصل ہو سکتے تھے۔ تمام صاحبزادیوں کے رشتے میں رسولِ اکرمؐ کے پسندیدہ دینی معیار کو شرطِ اول قرار دیا۔ اور اس کے ساتھ اگر اپنی جیسی حیثیت کا دنیوی معیار بھی جمع نہیں ہو سکا تو ادنیٰ پرواہ نہیں کی ...... کتنی عظیم قربانی ہے آجکل کے ماحول میں معیارِ سنت کی خاطر اپنے لختِ ہائے جگر کے دنیوی عیش و آرام کے امکانات کو قربان کر دینا! اور کس پائے کا اخلاص ہے اپنے دین اور عشق رسالت میں!

ان اوصاف کا لازمی تقاضا تھا کہ اس شخصیت میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے دردمندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی تڑپ بھی ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا سینہ ان جذبات کا بھی گنجینہ تھا۔ اسلامی دنیا میں کہیں کوئی ناگوار واقعہ ہوتا تو بالکل طبعی انداز کے رنج کی کیفیت طاری ہوتی اور کوئی خوش کن خبر ملتی تو طبیعت سرور و نشاط سے لبریز ہو جاتی اور اس کے اثرات دیکھنے میں آتے، مرحوم کے جو بعض خطوط کا سلسلہ اسی شمارہ سے شروع کیا جا رہا ہے اس سے اچھا خاصہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سینے میں اعلاء کلمۃ اللہ کی کیسی تڑپ اور اسلام کے لیے کیسا درد تھا[1]۔

بزرگوں کی اخلاقی شانیں مختلف ہوتی ہیں۔ کسی میں خوش اخلاقی کا کوئی رنگ ہے کسی میں کوئی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خوش اخلاقی میں ایک عجیب باوقار جمال تھا، کشادہ جبینی اور خندہ روئی کے ساتھ، ملنے والوں کا استقبال فرماتے۔ عین سنت کے مطابق پورے رُخ کے ساتھ التفات ہوتا۔ ڈاکٹری کا پیشہ ہونے کی بنا پر وقت بے وقت اُن سے ضرورت پڑتی رہتی، ہمیشہ ایک ہی انداز سے متوجہ ہوتے ہوئے پایا۔ مسجد میں نماز کے بعد کچھ عرض کرنا ہوا تب، مطب سے گھر تک یا مسجد سے گھر تک کے راستے ہی میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت پڑ گئی تب، اور گھر کی آرام گاہ میں اجازت لے کر جا پہونچے تب۔ کشادہ جبینی تھی کہ کسی وقت جدا نہیں ہوتی تھی، خاموش اور باوقار چہرے پر شفقت جیسے بولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر حاضری قریب سے قریب تر کرتی اور دل میں محبت کا تعلق اُبھارتی۔ بلا شائبہ تکلف اس خادم کو تو وہ بالکل اپنے خاندان کے

---

[1] ڈاکٹر صاحب مرحوم کے چند اہم مکتوبات مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مرتب کیے ہوئے الفرقان کے متعدد شماروں میں شائع کیے گئے تھے

ایک بزرگ محسوس ہوتے۔ اُن کی خاموش مجلس میں جی لگتا اور بغیر کسی ضرورت ہی کے جاکر کچھ دیر بیٹھنے کو دل چاہتا۔

مرحوم اپنی ذات اور اپنے ظاہری و باطنی کمالات سے خود بھی ایک نہ بھولنے والی شخصیت ہیں۔ مگر ایک زندہ (اور ان شاء اللہ زندۂ جاوید) یادگار بھی ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں، اور وہ ہیں ہمارے محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (مد اللہ ظلہم) مولانا کے والد مرحوم اُن کو صرف نو سال کا چھوڑ کر اس دُنیا سے رخصت ہو گئے تھے، اس دن سے ڈاکٹر صاحب کے روزِ وفات تک وہ اپنی والدۂ محترمہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ہی کے سایۂ عاطفت میں رہے اور انھیں کے دامنِ شفقت میں تعلیم و تربیت کے سارے مراحل طے کیے۔ مولانا محترم کی آج کی پوری شخصیت انھیں کی تربیت و شفقت کا فیض ہے اور فیض بھی کیسا جاری فیض! اللہ تعالیٰ اس فیض کو مدتوں جاری رکھے اور ڈاکٹر صاحب کے رفعِ درجات کا ذریعہ بنائے۔

کیسا قابلِ رشک اور قابلِ تقلید ہے وہ بندہ جو عمر بھر اپنے دونوں ہاتھوں سے بھی آخرت کمائے، اور اپنے بعد بھی اس کمائی کا ایک عظیم ذریعہ چھوڑ جائے۔ خدا اس کی بال بال مغفرت فرمائے، انبیاء و صالحین کا قرب عطا فرمائے اور پسماندگان کے دلوں پر اپنے فضلِ خاص سے سکینت برسائے۔

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد منظور نعمانی

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رح

(ربیع الاول ۱۳۸۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

کئی مہینے سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق اخبارات میں ایسی خبریں آ رہی تھیں جو ان کی صحت کی طرف سے بہت ہی مایوس کرنے والی تھیں اور انھیں پڑھ کر دل میں یہی خطرہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید احکم الحاکمین کی مشیت اور اس کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ اس مرض ہی میں دنیا سے اٹھا لئے جائیں ـــــ یہی ہوا اور پچھلے ہفتہ ۲۲ راگست کے اخبارات میں ان کی وفات کی خبر آگئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ

دل اس خبر سے بہت متاثر ہوا۔ اور حافظہ نے بھولی بسری باتوں کی ایک ضخیم کتاب دل کی آنکھوں کے سامنے کھول دی۔ ان کی خبر وفات سن کر میں اپنے گھر کے بچوں کے سامنے جن میں سے کسی نے تو ان کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا، ہاں میری ہی زبان سے نام بار بار سنا تھا۔ اُن کا تذکرہ کرنے لگا، اسی سلسلۂ گفتگو میں ان کی زندگی کے بعض ایسے اہم اور قابل ذکر واقعات بھی ذکر میں آگئے جو شاید کہیں لکھ کر محفوظ نہ کئے گئے ہوں، جی چاہا کہ ان کو قلمبند کرا کے محفوظ کر دیا جائے۔

آج وہ ہماری اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اور ان کو ہمارے کسی خراج عقیدت اور کسی تحسینی تذکرے کا انتظار بھی نہیں ہے ـــــ جو چیز اس دوسرے عالم میں ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لائق ہے، اور جس کا پہنچنا بھی انشاء اللہ یقینی ہے، وہ اچھی ساعتوں میں ان کے لئے رحمت و مغفرت کی پُرخلوص دعائیں اور اعمالِ خیر کے ثواب کا ہدیہ ہے۔ اور یہی ان کی محبت کا اُن کے محبین پر خاص حق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حق کے ادا کرنے کی توفیق دے۔

اسی کے ساتھ یقین ہے کہ ان کی بعض ایمانی خصوصیات اور ان کی زندگی کے بعض واقعات

کا تذکرہ انشاء اللہ زندوں کے لئے ضرور نافع ہوگا، اسی اُمید پر یہ سطریں ایک عزیز سے بطور املا لکھا رہا ہوں۔

جہاں تک اب یاد آتا ہے اخبارات میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام سب سے پہلے اس ناچیز نے اس وقت پڑھا جب لاہور کے ایک دریدہ دہن آریہ سماجی نے اللہ کے آخری رسول سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک نہایت گندی اور رسوائے عالم کتاب لکھ کر شائع کی، اُس کتاب کا نام بھی اتنا خبیث اور دل آزار تھا کہ کوئی شریف آدمی خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو، دلی تکلیف کے بغیر وہ نام نہیں لے سکتا —— ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا شدھی سنگھٹن کی فتنہ انگیز تحریک نے پہلے ہی سے کافی خراب کر دی تھی، اس کتاب کی اشاعت نے آگ پر تیل کا کام کیا —— اور مسلمانوں میں سخت ہیجان بلکہ طوفان برپا ہو گیا اس سلسلہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں ایک تقریر کی تھی، اُس کا اثر یہ ہوا تھا کہ پردہ نشین خواتین نے اپنے بچے اُن کے قدموں میں ڈال دیئے تھے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر قربان کر دو۔ سید عطاء اللہ شاہ اِس تقریر پر گرفتار کر لئے گئے، ان پر مقدمہ چلا اور بالآخر ان کو غالباً دو سال کی قید سخت ہوئی —— بہرحال جہاں تک اب یاد ہے میرے دل میں اُن کی غائبانہ محبت کا بیج اُسی زمانہ میں، اخبارات میں ان کا تذکرہ دیکھ دیکھ کر پڑا۔ پھر مختلف تحریکوں اور سرگرمیوں کے سلسلہ میں اخبارات میں اُن کا نام آتا رہا،

یہاں تک کہ ایک وقت اخبارات میں آیا کہ انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں (جس میں پنجاب کے علماء حق کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔) سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت قرار دیئے گئے، اور اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم دین اور سب سے بڑی دینی درس گاہ (دار العلوم دیوبند) کے صدر و شیخ الحدیث، استاذ نا و استاذ العلماء حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری (قدس سرہ) نے بھی بہ حیثیت امیر شریعت اُن کے ہاتھ پر بیعت کی —— اخبارات میں یہ خبر پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر اپنی نظر میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی عظمت و اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی اور دید و ملاقات کا دل میں بڑا اشتیاق پیدا ہو گیا —— ان کے نام کے ساتھ "بخاری" اور "شاہ" کے دو پُر عظمت ضمیمے لگے ہونے کی وجہ سے میرا تصور اس وقت ان کے بارہ

میں یہ تھا کہ اُن کی شکل وصورت بخاری علماء کی سی اور وضع وہیئت مشائخ طریقت کی سی ہوگی۔
لیکن اتفاق کی بات عرصہ تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ میں ۱۹۳۰ء میں امروہہ (ضلع مراد آباد)
میں مدرس تھا حسنِ اتفاق کہ اس سال جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس امروہہ ہی میں ہونا طے ہوگیا، اس
زمانہ میں مجھے جمعیۃ العلماء اور اسکے کاموں سے خاصی دلچسپی تھی، یہ وہ وقت تھا کہ چند ہی مہینے
پہلے آل انڈیا کانگرس نے اپنے لاہور کے اجلاس میں ۱۹۲۹ء والی اُس نہرو رپورٹ کو منسوخ قرار
دے کر جس کی بنا پر ۱۹۲۹ء میں جمعیۃ علماء ہند بھی کانگرس سے الگ ہوگئی تھی آزادی کامل کی
تجویز پاس کی تھی، اور پھر اسکے بعد گاندھی جی نے نمک سازی کی شکل میں انگریزی اقتدار
کے خلاف سول نافرمانی کی جنگ گجرات سے شروع کردی تھی۔ بہر حال امروہہ میں جمعیۃ العلماء
کا یہ اجلاس اِس زمانہ اور اِس ماحول میں ہونے والا تھا۔

اِدھر ایک بات اسی درمیان میں یہ ہو چکی تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم اور جمعیۃ العلماء کے درمیان
سخت اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے مقابلہ میں
ایک دوسری "جمعیۃ العلماء" بنالی گئی تھی۔ جس کے صدر خود مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ یہ کشمکش
ناسخیدگی میں کس حد تک جا چکی تھی)، اس کا اندازہ بس اِسی سے کیا جا سکتا ہے کہ جمعیۃ علماء
ہند دہلی کا اجلاس امروہہ میں جن تاریخوں میں ہونا طے ہوا تھا۔ ٹھیک انہی تاریخوں میں امروہہ ہی
میں اس دوسری جمعیۃ کا اجلاس بھی طے کیا گیا۔ اور ہوا! اور خود مولانا محمد علی مرحوم نے اس
کی صدارت کی۔

الغرض جمعیۃ العلماء ہند کے امروہہ والے اس اجلاس کی غیر معمولی اہمیت کی ایک وجہ تو یہ
تھی کہ کانگرس کی طرف سے نہرو رپورٹ کی تنسیخ اور آزادی کامل کے رزولیوشن اور گاندھی جی کے
سول نافرمانی کی جنگ چھیڑ دینے کے بعد جمعیۃ العلماء کے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال آگیا تھا کہ
کانگرس اور اسکی جنگ آزادی کے بارے میں اب اس کا رویہ کیا رہے گا؟ کیوں کہ نہرو رپورٹ کی
منسوخی کے بعد وہ بنیاد ختم ہوگئی تھی جس کی وجہ سے جمعیۃ نے ۱۹۲۹ء میں کانگرس سے علٰحدگی
اختیار کی تھی۔ اور اسی بنا پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (جو اگرچہ اس وقت جمعیۃ کے اکابر میں
یا ہائی کمانڈ نہیں تھے لیکن اپنے سیاسی ذہن اور جرأت وفعالیت کی وجہ سے اپنے اقران میں

سب سے زیادہ ممتاز تھے۔) کانگرس کے ساتھ اشتراک کے بارے میں ایک رزولیوشن بھی اجلاس کے لئے بھیج دیا تھا اور اخبارات میں اس کی اشاعت بھی ہوگئی تھی اور خود جمعیۃ کی صفوں میں اس وقت اس بارہ میں خاصا اختلاف رائے تھا ——— بہرحال امروہہ کے اس اجلاس کی غیر معمولی اہمیت کی ایک وجہ تو یہ تھی، کہ اس میں وقت کا یہ اہم اور سخت اختلافی مسئلہ سامنے آنے والا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم والی جمعیۃ کے اجلاس نے قدرتی طور پر ایک مقابلہ اور کشمکش کی فضا بنا دی تھی ——— اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر اب سنیے! !

جمعیۃ کا اجلاس شروع ہونے سے ایک دو دن پہلے ہی قریبی مقامات سے جمعیتی رضاکاروں کے جتھے انتظام کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ میرے وطن سنبھل کا ایک جتھا ایک دن پہلے پہنچنے والا تھا اس میں کے بعض آدمی علی الصبح پہنچ گئے، اور انھوں نے بتایا کہ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہمارا جتھا ایک جلوس کی شکل میں امروہہ میں داخل ہو، اس جلوس میں کچھ اونٹ ہوں، ان پر نقارے ہوں، اس لئے ہمارے واسطے اونٹوں اور نقاروں کا انتظام کر دیا جائے (دراصل سنبھل کے رضاکار اس طرح کے "حجازی" جلوس نکالا کرتے تھے۔) ہم لوگ جو امروہہ میں اس وقت اجلاس کے کاموں کے ذمہ دار تھے، ان کے سامنے یہ مسئلہ آیا، تقریباً ۸-۹ بجے صبح کا وقت تھا، مجلس استقبالیہ کے دفتر میں بیٹھے ہم اسی مسئلہ پر مشورہ کر رہے تھے کہ اونٹوں نقاروں والا یہ حجازی نما جلوس یہاں نکلنا مناسب ہے یا نہیں۔ میری اور اکثر کارکنوں کی رائے اس وقت کے حالات میں جلوس کے حق میں تھی۔ لیکن ہم سب کے مخدوم اور ہر حیثیت سے بزرگ حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ امروہہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی رائے نہیں تھی۔ ان کو غالباً اس کے جواز میں بھی شبہ تھا۔ یا وہ اس کو ثقاہت اور سنجیدگی کے خلاف سمجھتے تھے۔ یہ مشورہ چل ہی رہا تھا کہ اچانک دو حضرات دفتر میں داخل ہوئے ان میں ایک تو حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے جو میرے لیے جانے پہچانے ہی نہیں بلکہ میرے استاد تھے اور ان کے ساتھ جو دوسرے صاحب تھے ان کو ہم میں سے کوئی نہیں پہچانتا تھا، ان کی وضع یہ تھی کہ ہاتھ میں بہت موٹا سا ایک سونٹا، جسم پر کھدر کا چھوٹا سا قمیص نما نیم آستین کرتا، اور غالباً کھدر ہی کا رنگا ہوا نیلا تہبند، جسم بالکل پہلوانوں کا سا۔ میں سمجھا کہ یہ مفتی صاحب کے ساتھ

کوئی رضاکار ہیں، اتنے میں خود مفتی صاحب نے بتایا کہ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں، یہ سن کر سب کی، خاص کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیوں کہ میرے تصور میں تو ان کی صورت اور وضع بخاری کے کسی مقدس شیخ خانقاہ کی سی تھی، مصافحہ اور ملاقات کے بعد بڑی بے تکلفی کے ساتھ شاہ صاحب نے ہم لوگوں سے فرمایا، کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا ہم لوگ ایک چھوٹے سے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ سنبھل کے رضاکاروں کا جتھا آرہا ہے وہ اس طرح کا جلوس نکالنا چاہتا ہے، ہم میں سے کچھ کی رائے ہے کہ نکلنا چاہئے اور بعض حضرات اس کو ٹھیک نہیں سمجھتے۔ شاہ صاحب نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ اس وقت کے مفتی ہم ہیں، ہم فتویٰ دیتے ہیں کہ ایسا جلوس نکلنا چاہیئے۔ منگواؤ اونٹ اور نقارے ایک اونٹ پر میں خود بھی بیٹھوں گا۔

اس عاجز کی سب سے پہلی ملاقات شاہ صاحب سے یہی تھی۔ اور ان کے انداز و مزاج کا یہ پہلا تجربہ تھا، جہاں تک یاد ہے یہ جمعہ کا دن تھا۔ جلوس کی تیاریاں فوراً شروع ہو گئیں۔ اور اسی شان سے جلوس نکلا، اور پورے بازار کا اس نے گشت کیا، مشورہ سے یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ آج بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں شاہ صاحب کی تقریر ہوگی۔ (واضح رہے کہ اجلاس بھی جامع مسجد ہی میں ہونے والا تھا، اسی میں پنڈال بنا تھا۔) جلوس ہی نے شاہ صاحب کی تقریر کا اعلان کیا۔ اس زمانہ میں شاہ صاحب کی اخبارات میں بہت دھوم تھی اور ان کی زندگی کے بعض واقعات نے مسلمانوں کے بہت بڑے طبقہ کو ان کا نادیدہ عاشق بنا دیا تھا۔ پھر امروہہ میں بلکہ ہمارے اس علاقہ ہی میں شاہ صاحب کی یہ پہلی آمد تھی۔ اور اس دن امروہہ میں کوئی دوسرا جلسہ بھی نہیں تھا۔ (کیوں کہ دونوں جمعیتوں کے باقاعدہ جلسے کل سے شروع ہونے والے تھے۔) اس لیے شاہ صاحب کی تقریر سننے کے لیے آج بہت سے وہ لوگ بھی آگئے جن کی دلچسپی دوسری جانب تھی اور جمعیۃ علماء ہند کے سخت مخالف تھے۔

نماز جمعہ کے بعد تقریر شروع ہوئی۔ یہ پہلی تقریر تھی جو اس ناچیز نے شاہ صاحب کی سنی، اس میں انشاء اللہ بالکل مبالغہ نہیں کہ پورا مجمع بالکل مسحور تھا۔ جمعیۃ العلماء کے

مخالفین کی طرف سے اُس وقت دو باتوں کا خاص طور سے پروپیگنڈا کیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ یہ لوگ کانگرس سے اور ہندوؤں سے مل جانے والے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ یہ دیوبندی وہابی ہیں، نجدیوں کے حامی ہیں۔ دشمن رسُول ہیں (معاذ اللہ) اس دوسری بات کے اُچھالے جانے کی خاص وجہ یہ تھی کہ دوسری جمعیۃ کے اجلاس کا داعی اتفاق سے امروہہ کا وہ عنصر تھا۔ جس کے نزدیک دیوبندی وہابیوں کی تکفیر کے سوا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی دوسرا مسئلہ قابل توجہ نہیں تھا۔ شاہ صاحب کے علم میں یہ صورتِ حال ہم لوگوں کے ذریعہ آچکی تھی، اس لئے ساری تقریر کا محور یہی دو مسئلے رہے۔ اس تقریر نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ اپنی پُوری زندگی میں کسی تقریر کا ایسا اثر مجھے یاد نہیں، رسُول دشمنی والے ناپاک اتہام کے سلسلہ میں کچھ کہتے ہوئے جب شاہ صاحب نے مولانا جامیؒ کے دو شعر ایک موقع پر پڑھے تو دو آدمی تڑپ کر بیہوش ہو گئے۔ جن کو بہت دیر کے بعد ہوش آیا ـــــ یہ تقریر تقریباً ڈھائی گھنٹے تک ہوئی اور یہ واقعہ ہے کہ اسی پہلی تقریر نے سینوں کو انگریز دشمنی کے جذبہ سے بھر دیا اور امروہہ کی فضا کو جمعیۃ کے حق میں اور آزادی کی جنگ میں کانگرس کے ساتھ اشتراک کے حق میں ہموار کر دیا۔

یہ بات ذکر کرنے سے رہ گئی، کہ شاہ صاحب اجلاس سے ایک دن پہلے اچانک کیوں اور کیسے آ گئے؟ ہوا یہ کہ جب گاندھی جی نے سول نافرمانی شروع کر دی تو شاہ صاحب نے اس کی حمایت و تائید میں حسب عادت پرجوش تقریریں شروع کر دیں، اُن کو پتہ چلا کہ وہ بہت جلد گرفتار کر لئے جانے والے ہیں اور اندازہ یہ تھا کہ امروہہ کے اجلاس کو جاتے ہوئے راستہ ہی میں غالباً ان کو گرفتار کیا جائے گا اس لئے وہ چکر کاٹ کے اور کچھ راستہ کار کے ذریعہ طے کر کے ایک دن پہلے ہی امروہہ پہنچ گئے کہ کسی طرح اجلاس میں شریک ہو سکیں اور کانگرس کے ساتھ اشتراک کا رزولیوشن پاس کرا سکیں۔ اگلے دن اجلاس باقاعدہ شروع ہوا، صدر استقبالیہ، حکیم سید ابو النظر رضوی (مرحوم) تھے ان کا خطبہ بڑا وقیع اور جاندار تھا، اس میں مدلل طور پر کانگرس کے ساتھ اشتراک کے خلاف رائے ظاہر کی گئی تھی، صدر اجلاس مولانا معین الدین صاحب اجمیری (رحمۃ اللہ علیہ) تھے اور

اُن کے خطبہ میں بھی اس مسئلہ میں یہی رہنمائی کی گئی تھی، ان دونوں خطبوں نے کانگرس میں شرکت
اشتراک کے مسئلہ کو اور بھی مشکل بنا دیا تھا، لیکن آخر کار مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تجویز کے حق
میں ہی فیصلہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس فضا میں اس تجویز کے پاس کرا لینے میں سب سے زیادہ حصہ
سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کا تھا۔ عام و خاص مجالس کی اس شخص کی تقریروں نے فضا پلٹ
دی معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کا بندہ تقریر نہیں کرتا سحر کرتا ہے۔

ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی گرفتاری کا ہر وقت خطرہ تھا۔ ادھر
یہ پالیسی طے تھی کہ جہاں تک اور جس طرح ہو سکے اس وقت وہ اپنے کو گرفتاری سے بچائیں اور
جمعیۃ کا یہ تازہ پیغام ہندوستان بھر میں پہنچائیں اور مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ جنگ آزادی
میں شریک ہونے کی دعوت دیں۔ امروہہ میں اجلاس کے دوران ہی میں بعض مخصوص ذرائع سے یہ
معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کی گرفتاری کے احکام آگئے ہیں اور وہ اجلاس ختم ہونے کے بعد روانگی
کے وقت گرفتار کر لئے جائیں گے۔

چونکہ طے شدہ پالیسی یہی تھی کہ وہ حتی الامکان گرفتاری سے اپنے کو بچائیں اس لئے یہ چال چلی
گئی کہ آخری رات کے آخری اجلاس کے لئے اُن کی تقریر کا خاص طور سے اور بار بار اعلان کیا
گیا اور اس طرح عوام کو مشتاق بنانے کے ساتھ پولیس کو بھی شاہ صاحب کے بارے میں مطمئن کر
دیا گیا، اور ہوا یہ کہ شاہ صاحب ایک بڑے عجیب و غریب طریقہ پر دن [illegible]
سے نکل گئے اور امروہہ کا اسٹیشن چھوڑ کر ایک دوسرے قریبی اسٹیشن [illegible]
اور یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ ان کی روانگی کا انتظام کرنے والے دو چار آدمیوں کے علاوہ
اپنوں میں بھی کسی کو خبر نہیں ہوئی، رات کو مولانا احمد سعید صاحب (علیہ الرحمہ) کی
شروع ہوئی اس دن مولانا کی تقریر بھی بڑی غیر معمولی قسم کی ہوئی، اس کے باوجود
ہوتا رہا کہ مجمع بڑی بے چینی کے ساتھ شاہ صاحب کی تقریر کا منتظر اور مشتاق ہے مولانا نے دو
قریب دو بجا دیے اور ایک دم کلائی کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے فرمایا، اوہو! دو بجنے کو آئے
ہیں! لو بھئی السلام علیکم، اب شاہ صاحب کی تقریر پھر کبھی سن لینا! یہ سن کر پولیس والے بھی

ہکا بکا رہ گئے۔

شاہ صاحب نے امروہہ سے نکل کر ایک طوفانی دورہ شروع کیا، وہ عرصہ تک گرفتار نہ ہوسکے، انھوں نے قریباً پورے شمالی ہند کا دورہ کر لیا، ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی میں جو ہزارہا مسلمان جیل گئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی بہت بڑی تعداد تنہا شاہ صاحب ہی کی پرجوش اور آتشیں تقریروں کے حساب میں تھی۔

——— اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنی کشش اور تاثیر دی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ غالباً اپنے اسی دورہ میں وہ بدایوں بھی گئے، مولانا عبد القدیر صاحب بدایونی مرحوم کے یہاں ہوئے، معلوم ہے کہ موصوف اپنے بدایونی مسلک میں کیسے پختہ تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری (بریلوی حضرات کی اصطلاح کے مطابق) ٹھیٹ وہابی ہیں، اسکے علاوہ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا بدایونی مرحوم امروہہ کے اجلاس میں "کانگرس کی جنگ آزادی میں شرکت" والے رزولیوشن کے اہم مخالفین میں تھے ——— لیکن اس اختلاف مسلک اور سیاسی اختلاف رائے کے باوجود سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں اور ان کے خلوص سے ان کا قلب اتنا متاثر تھا کہ کھانے کے لیے ہاتھ دھونے کے وقت خود سلچی اور لوٹا ہاتھ میں لے کر شاہ صاحب کے ہاتھ دھلاتے تھے اور اپنے شدید اصرار سے شاہ صاحب کو اس معاملہ میں مجبور کر دیتے تھے ——— اللہ تعالیٰ دونوں پر اپنی رحمتیں فرمائے۔

یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر ایک بات درمیان میں آگئی تھی ورنہ ذکر ان کے ۱۹۳۰ء کے دورہ کا ہو رہا تھا، انھوں نے پنجاب سے بنگال تک کا دورہ کیا اور بنگال جا کر گرفتار ہوئے اور سزا پا کر وہیں گلی پور جیل میں رہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ شاہ صاحب اور اسی طرح ان کے خاص رفقا کو اپنی اس جدوجہد اور قربانی سے اسکی امید بالکل نہیں تھی کہ کانگرس اور اسکے لیڈروں کی طرف سے اس کا اعتراف بھی کیا جائے گا۔ یا وہ اس قربانی کے ذریعہ کانگرس میں کوئی پوزیشن حاصل کر سکیں گے، بلکہ اسکے برعکس انھیں سابق تجربوں کی بناء پر پورا یقین تھا کہ کوئی ایسا مسلمان

کانگرس میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں کرسکتا جو اسلام اور مسلمانوں کا بھی پورا وفادار اور اس موضوع پر بھی لڑ جانے والا ہو ــــــ اور بالکل یہی چیز سامنے آئی ۱۸۵۷ء کی اس جنگ آزادی کے بعد جب دوسری گول میز کانفرنس سے پہلے گاندھی اِرون پیکٹ ہوا، اور سارے سیاسی قیدی رہا کئے گئے اور اس کے بعد کراچی میں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس ہوا تو پنجاب کانگرس نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ کیا کہ سید عطاء اللہ شاہ اور ان کے رفیقوں کو کانگرس کے نظام سے دُور رکھا یہاں تک کہ کراچی کے اجلاس میں یہ لوگ صرف شاہد کی حیثیت سے شریک ہو سکے۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ اور اُن کے رفقاء کے سامنے اس جد و جہد اور قربانی کا محرک صرف یہ تھا کہ کانگرس انگریز کو ہندوستان سے بیدخل کرنے کے لیے ایک لڑائی لڑ رہی ہے۔ ہمیں صرف اس مقصد کی خاطر اس میں حصہ لینا چاہیئے ــــــ

کانگرس کے اس رویہ اور مزاج ہی کا تجربہ کرکے شاہ صاحب اور ان کے رفقاء نے اپنی ایک مستقل سیاسی تنظیم "مجلس احرار اسلام" قائم کرنے کی ضرورت سمجھی تھی لیکن اس کے باوجود ۱۹۴۷ء تک برابران کا رویہ و مسلک یہی رہا کہ وہ انگریزی اقتدار کے خلاف کانگرس کے ہر اقدام میں اس کے ساتھ بلکہ عمل اور قربانی میں آگے رہے اور اسی طرح لیگ سے کانگرس آویزش میں بھی وہ اپنی رائے اور ضمیر کے فیصلہ کے مطابق لیگ کے خلاف صف آرا رہے اور آزادی سے پہلے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کے دونوں جنرل الکشنوں میں بھی انھوں نے اپنی پوری طاقت کانگرس کے حق میں استعمال کی۔ اور اگر آزادی کا حصول کانگرس کی جد و جہد کا نتیجہ ہے تو بلا شبہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کا اس میں بہت بڑا حصہ ہے لیکن ہندوستان کے لیے یہ بات کتنی شرمناک ہے اور تاریخ اس کو کس طرح معاف کرسکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو سید عطاء اللہ شاہ کو اپنے وطن امرتسر سے نکل کر اس پاکستان میں جانا پڑا جس کی اس نے آخری وقت تک (بلکہ کانگرس کے پاکستان قبول کرلینے کے بعد تک بھی) بھرپور مخالفت کی تھی۔

میرا خیال ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ کے لیے بھی یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ اپنے رفیق خاص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی مرحوم کی طرح پاکستان کی طرف ڈھکیلے جانے کے بعد پھر ہندوستان واپس آجاتے اور شاید ہم مسلمانان ہندوستان کے لیے اُن کا یہاں آجانا کچھ مفید ہی ہوتا لیکن غالباً

اُن کے مجروح جذبات نے اُن کو اس پر آمادہ نہیں ہونے دیا کہ ایسے طوطا چشموں کا وہ کوئی احسان لیں اور ان سے کوئی امید رکھیں ـــــــ دوسری طرف پاکستان میں کئی حکومتیں بدلیں، لیکن سیاسی سرگرمیوں سے بالکل کنارہ کش ہوجانے کے باوجود قریباً ہر حکومت ہی کے وہ معتوب رہے ـــــــ کیسی بدقسمتی ہے اس ملک اور قوم کی جس کے پاس سید عطاء اللہ شاہ جیسی ایک طاقت موجود ہو اور وہ اس سے کوئی کام نہ لے اُس کو کوئی کام کرنے کا موقع بھی نہ دے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات نے ایک طویل تاریخ یاد دلاکر ہندوستانی مسلمانوں کے ایک ایسے مسئلہ کی طرف ذہن کو بڑی شدت سے متوجہ کردیا جو ۱۹۴۷ء کے بعد سے کچھ نظر انداز سا ہوتا جارہا ہے، حالانکہ اس سے پہلے کم ازکم مسلمانوں کے اُس مذہبی طبقہ کے نزدیک، جو آزادی کی جنگ میں اور اس کے سلسلہ کی قربانیوں میں آگے آگے رہا، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل میں اس مسئلہ کو خاص اہمیت بلکہ اولیت حاصل تھی، اس سے میری مراد ہے، آزاد ہندوستان میں ہماری دینی و ملی خصوصیات، اور ہمارے مخصوص شرعی قوانین (پرسنل لا) کے تحفظ کا مسئلہ ـــــــ میرا خیال ہے کہ گزشتہ دور کے جمعیۃ العلماء کے اجلاس کے خطبات میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا خطبہ نہ ہوگا جس میں اس مسئلہ کا تذکرہ مسلمانوں کے خاص الخاص اور سب سے اہم مسئلہ کی حیثیت سے نہ کیا گیا ہو، اسکے علاوہ مختلف موقعوں پر جمعیۃ نے جو فارمولے تجویز کئے اُن سب میں بھی اس مسئلہ کو مسلمانوں کی دینی و ملی زندگی کا اہم ترین مسئلہ قرار دے کر دفعات مرتب کی گئی تھیں ـــــــ اور مولانا سید محمد سجادؒ (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) نے تو ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۳ء میں "نظارت امور شرعیہ" کے عنوان سے ایک مکمل دستوری خاکہ بھی تیار کرکے شائع کیا تھا جس کے متعلق مرحوم کا خیال تھا کہ آزاد ہندوستان کی جمہوری حکومت کا جو نقشہ کانگرس کے سامنے ہے یہ خاکہ آسانی سے اس میں فٹ ہو سکے گا ـــــــ بہرحال ۱۹۴۷ء سے پہلے تک اس سلسلہ میں یہ سب کچھ ہوتا رہا ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا اور وہ وقت آیا جس کے لئے یہ ساری تجویزیں اور سارے فارمولے تھے تو ملک کے حالات اتنے خراب اور فضا اتنی تاریک تھی کہ ان سوالات کے اٹھانے کی واقعۃً کوئی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن ظاہر ہے کہ وہ دور گزر جانے کے بعد فضا وہ نہیں رہی ہے اور جس طرح جان و مال، عزت و آبرو اور دوسرے عام شہری حقوق میں مساوات کے سوالات ملک کے ذمہ داروں کے سامنے آچکے ہیں، اسی طرح

ضروری یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی اُسی سنجیدگی کے ساتھ جو اس کا حق ہے سامنے آئے ـــــ اس کے بتانے کی ضرورت نہیں ہو کہ اس معاملہ میں اب جتنی تاخیر ہوگی وہ مسئلہ کے لئے اسی قدر مضر ہوگی۔

ہمارے دوسرے مسائل جن کا تعلق ہماری مادی اور دنیوی ضرورتوں سے ہے، بہت اہم ہونے کے باوجود بھی ہمارے خاص مسائل نہیں ہیں، وہ تو ملک کے دوسرے بھی بہت سے طبقوں کے مسائل ہیں، ہمارے خاص مسائل تو دراصل وہی ہیں جن کا تعلق ہماری اسلامیت سے ہے ـــــ کم از کم اس مذہبی حلقہ کا تو ہر واقف کار خوب ہی جانتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ سے لیکر سید عطاء اللہ شاہ بخاری تک اس قافلہ کے تمام ہی مجاہدین نے ملت اسلامیہ ہند یہ کے انہی مسائل کو نصب العین کے طور پر سامنے رکھ کر قربانیاں دی تھیں اور اسی بنیاد پر وہ اپنی جدوجہد اور اپنی قربانیوں کو اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد اور قربانی سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اجر کی توقع رکھتے تھے۔

یاد آتا ہے کہ اب سے ۴۱-۴۲ سال پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی یا علی گڑھ کے اپنے خطبہ میں پہلی جنگ عظیم کے بعد مقامات مقدسہ اور ممالک اسلامیہ پر صلیبی طاقتوں کے تسلط کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس صورت حال سے آج ابوعبیدہ بن الجراح، معاذ بن جبل، سعد بن ابی وقاص اور خالد بن الولید کی روحیں بے چین ہیں ـــــ ان سطور کا لکھنے والا جو ایک سخت گنہگار قسم کا آدمی ہونے کے علاوہ بے عمل اور نکما بھی ہے ایسی کوئی بات کہنے کا ہرگز اہل نہیں ہے لیکن اس کا اپنا یہ احساس رہا ہے کہ اس مسئلہ میں ہماری کوتاہی اور ہمارا تغافل ہمارے ان بزرگوں کی روحوں کے لئے یقیناً اذیت اور بےچینی کا باعث ہوگا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا یہ باتیں یہاں ایک خاص تأثر کے تحت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ذکر کے سلسلہ میں بے اختیار زبان پر آگئیں، ان کا مقصد ہرگز کسی پر تنقید نہیں ہے، یہ عاجز اس قسم کے تمام امور میں سب سے زیادہ قصوروار اور مسئول اپنے ہی کو سمجھتا ہے۔

یہ سلسلہ بالکل غیر ارادی طور پر بہت طویل ہوگیا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی کے صرف ایک ہی پہلو کا اس میں ذکر آیا اور وہ بھی بہت ناتمام، اب اسی پر ختم کیا جاتا ہے اُن کے لکھنے والے دوستوں نے بہت کچھ لکھا ہوگا اور لکھیں گے۔ آخر میں ناظرین سے رسمی طور پر نہیں بلکہ دل کی گہرائی سے یہ درخواست ہے کہ اس عاجز کے تعلق سے بھی شاہ صاحب کے لئے اہتمام سے مغفرت و رحمت کی دعا فرمائیں اور ساری باتیں تو یہیں رہ جائیں گی لیکن آپکا یہ تحفہ ان شاء اللہ مرحوم تک پہنچکر ان کی راحت اور مسرت کا باعث ہوگا ـــــ واجرکم علی اللہ ۔

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا محمد عبد الشکور صاحب فاروقی مجددیؒ

میری واقفیت اور تأثرات

(ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

گذشتہ ناظرین کو اخبار اور دوسرے ذرائع سے اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ہو چکی ہو گی کہ ۲ ذیقعدہ دوشنبہ کے دن مغرب سے کچھ پہلے اہلسنت کے جلیل القدر ربانی عالم اور نقشبندی مجددی سلسلہ کے صاحب مقام اور صاحب ارشاد شیخ، حضرت مولانا محمد عبد الشکور صاحب فاروقی نے ہماری اس دنیا سے دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اغفر لہ ولا تفتنا بعدہ۔ ذیل میں حضرت مولانا مرحوم کے متعلق اپنی کچھ ذاتی معلومات اور تاثرات حوالۂ قلم کرنے کا ارادہ کیا ہے، امید ہے کہ خود راقم سطور کے لیے اور سعید و صالح فطرت رکھنے والے ناظرین کے لیے یہ تذکرہ ان شاء اللہ نفع مند ہو گا۔

اپنے وقت کے ایک مشہور صاحب لسان اور صاحب قلم عالم اور ہفتہ وار "النجم" لکھنؤ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے حضرت مولانا کا تذکرہ تو میں اپنے بچپن سے سنتا تھا، لیکن زیارت کا اتفاق سب سے پہلے اب سے قریباً ۳۶-۳۷ سال قبل (غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء) جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ مراد آباد میں ہوا تھا، چوں کہ مولانا کی شہرت ایک مقرر و مناظر اور ایک ہفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تھی، اس لیے دیکھنے سے پہلے ان کے بارے میں میرا تصور یہ تھا کہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے وہ روشن خیال اور فیشن ایبل قسم کے مولانا ہوں گے جیسے شیروانی وغیرہ پہنتے ہوں گے، شوقیہ چشمہ

لگاتے ہوں گے وغیرہ وغیرہ، لیکن مراد آباد کی ایک سڑک پر راستہ چلتے ہوئے کسی واقف نے جب مجھے بتایا کہ یہ مولانا صاحب جو پیدل چلے جا رہے ہیں یہی النجم کے ایڈیٹر مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی ہیں، تو اپنے تصور کے بالکل خلاف مولانا کی ہیئت اور وضع قطع دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، بالکل پرانی قسم کے سیدھے سادے علماء کی وضع تھی، سر پر وہی پرانے علماء کا سا عمامہ، جسم پر عبا، ہاتھ میں لاٹھی سا عصا ــــــ جمعیۃ کے اجلاس عام میں مولانا کی بھی تقریر کا وقت رکھا گیا تھا، آپ نے بجائے اس کے کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم کا لحاظ فرماتے ہوئے اس کے مناسب کوئی سیاسی یا نیم سیاسی یا کم از کم متکلمانہ و فلسفیانہ قسم کی کوئی علمی تقریر فرماتے، بس وعظ فرمایا، جس کا بڑا حصہ نماز سے متعلق تھا، قدرتی طور پر بہت سوں کو تعجب ہوا کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم پر ایسے وعظ کا کیا موقع تھا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ عرصہ سے مولانا کا یہ التزام ہے کہ وہ ہر تقریر میں نماز کی خاص طور سے تلقین و تاکید فرماتے ہیں اور گویا یہ اُن پر طاری ہے۔

ــــــ پھر اسی سال کچھ عرصہ کے بعد ایک ضرورت سے امروہہ میرا جانا ہوا، میں ان دنوں منطق و فلسفہ اور اصول فقہ و علم کلام کی آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مولانا آج کل مدرسہ اسلامیہ چلّہ (امروہہ) میں صدر مدرس ہیں، میں مولانا کی زیارت کے ارادہ سے، نیز اس نیت سے کہ موقع ملے گا تو کسی سبق میں بھی شریک ہو کر استفادہ کروں گا۔ مدرسہ گیا لیکن اس وقت اتفاق سے طب کی مشہور کتاب نفیسی کا آپ کے یہاں درس ہو رہا تھا، میں بیٹھا تو پورے سبق میں رہا، لیکن وہ میری دلچسپی کی چیز نہیں تھی، البتہ یہ بات اسی دن معلوم ہوئی کہ مولانا فن طب کے بھی فاضل ہیں۔ بعد میں جب حالات سے زیادہ واقف ہونے کا موقع ملا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے شروع میں کچھ عرصہ مطب بھی کیا تھا لیکن بعد میں اس سے بالکل کنارہ کش ہو کر ان خالص علمی اور دینی کاموں میں مشغول ہو گئے جو اللہ کو آپ سے لینے تھے۔

رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد اتفاق سے تین سال میں اسی مدرسہ اسلامیہ میں مدرس رہا جس سے مولانا کا تعلق رہا تھا، اس مدرسہ کے اکثر کار پرداز اور ارباب انتظام چونکہ حضرت مولانا سے عقیدت دارادت کا خاص تعلق رکھتے تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے

مولانا نے اپنے منجھلے صاحبزادے مولوی عبدالمومن صاحب فاروقی کو تعلیم کے لیے وہاں بھیج دیا تھا، اس لئے سال میں دو چار مرتبہ مزید، مولانا کی تشریف آوری امروہہ میں ہوتی تھی، اور میری طبیعت کو چونکہ مولانا سے خاص مناسبت تھی اور مذاہب باطلہ اور فرقہ ہائے ضالہ کی تردید سے اس زمانہ میں راقم سطور کو بھی گہری دلچسپی تھی اور مولانا بھی انھیں وجوہ سے ناچیز پر خاص الخاص عنایت و شفقت فرماتے تھے، اس لئے ہر ملاقات میں ربط و تعلق بڑھتا اور گہرا ہوتا رہا ـــــ کچھ عرصہ کے بعد (غالباً ۱۳۵۰ھ میں) حضرت مولانا کے ساتھ رنگون اور برما کے بعض دوسرے مقامات کا ایک طویل سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ سفر اہل رنگون کی دعوت پر وہاں ایک مذہبی فتنہ کے سر اٹھانے کی وجہ سے کرنا پڑا تھا، اس سفر میں قریباً ایک مہینہ شب و روز مولانا کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اور ممدوح کو اب تک جو کچھ جانا اور سمجھا تھا، اس سفر میں اُس سے بہت زیادہ جانا اور سمجھا، پھر برما کے اس سفر کے غالباً ایک ہی سال بعد مولانا نے دارالمبلغین قائم فرمایا اور اس میں کام کرنے کے لئے اس عاجز کو بھی بلایا، اس موقع پر بھی چند مہینے ایک نیاز مند رفیق کی حیثیت سے حضرت مولانا کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا اتفاق ہوا ـــــ اس کے بعد بھی بار بار سفر و حضر میں مولانا کے قریب بلکہ ساتھ رہنے کا اس قدر اتفاق ہوا کہ دورِ طالب علمی کے بعد اپنے مخصوص اساتذہ کے ساتھ بھی اتنا رہنے کا اتفاق غالباً نہ ہوا ہوگا۔

قریباً ۳۵ سال کے اس تعلق میں مولانا کی زندگی کے جن علمی، عملی اور اخلاقی پہلوؤں سے میں واقف اور متأثر ہوا، کسی ترتیب کا لحاظ کئے بغیر ان میں سے چند آج کی صحبت میں حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا کے بارے میں اپنی معلومات اور تاثرات کو میں دو حصوں میں تقسیم کرسکتا ہوں، ایک وہ جن کا تعلق علم و تحقیق، اور تصنیف و مناظرہ کی لائن کے امتیازات سے ہے، اور دوسرے وہ جن کا تعلق عبادت گزاری اور پرہیزگاری جیسی درویشانہ صفات سے ہے۔

علمی رسوخ | ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی حضرت مولانا کی شہرت مسلک اہلسنت کے ایک لائق وکیل اور کامیاب مناظر و متکلم کی حیثیت سے رہی ہے اور اس کام کے لئے یہ واقعہ ہے

کہ ہمارے اس زمانہ میں کسی خاص درجہ کے رسوخ علمی کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے جن لوگوں کو مولانا کے قریب رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا ان کو غالباً بالکل اندازہ نہیں ہوگا کہ ممدوح صرف مناظر و مصنف ہی نہیں بلکہ علمائے راسخین میں سے تھے، نامور اصحاب درس کی سی ٹھوس علمی استعداد اور اپنے دائرہ میں مطالعہ بہت وسیع تھا، اسی کے ساتھ قدرت نے حافظہ بے نظیر دیا تھا۔ راقم سطور نے اپنی عمر میں بہت کم حضرات ایسے قوی الحافظہ دیکھے ہیں[1] سلامتی فہم کے ساتھ ذہانت و ذکاوت سے بھی اللہ تعالیٰ نے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، ان سب چیزوں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے خالص علمی حیثیت سے بھی مولانا کا مقام بہت بلند تھا ـــــ علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے علم قرآن سے خاص شغف تھا، آپ کا سلسلہ تفسیر آیات آپ کے تدبر فی القرآن کی زندہ اور باقی رہنے والی شہادت ہے۔

لہ جن لوگوں نے حضرت مولانا کی تقریریں سنی ہیں انھیں یاد ہوگا کہ صرف قرآنی آیات و احادیث ہی نہیں بلکہ شیعوں کی کتب حدیث و اسماء الرجال اور بعد کے اُن کے مصنفین کی کتابوں کی بھی لمبی لمبی عبارتیں حتیٰ کہ شاذان... کے صفحے مولانا بالکل حافظوں کی طرح پڑھتے تھے۔ مولانا کی اس آخری بیماری ہی کا واقعہ ہے مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ فردوسی نے شاہ نامہ میں اپنے آتش پرست نسلی اکابر کا تذکرہ جس فخریہ انداز میں کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں صحابہ کرامؓ کو جس طرح اس نے حقیر و بے حیثیت دکھانے کی کوشش کی ہے اس کے خلاف ایرانی مسلمانوں کی طرف سے کوئی آواز اس وقت اٹھی تھی یا نہیں؟ مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی آواز اٹھی ہوگی تو مولانا کو اس کا ضرور علم ہوگا، میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، بیماری اور اس کے پیدا کردہ ضعف نقاہت کے علاوہ برسوں پہلے سے مولانا کے لیے بڑھاپے کا وہ وقت آچکا تھا جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "لکیلا یعلم بعد علم شیئاً"[عہ] ضعف کی وجہ سے مولانا کیلئے اس وقت بات کرنا بھی مشکل تھا، اس کے باوجود میں نے یہ بات دریافت کی، فرمایا کہ "صحیح العقیدہ ایرانی مسلمانوں کی طرف سے شاہ نامہ کے خلاف بڑے زور کے ساتھ آواز اٹھی تھی" "صولت فاروقی" ایک مستقل کتاب لکھی گئی، یہ منظوم ہے اور گویا شاہ نامہ کا جواب ہے، چھپ بھی چکی ہے، میں نے اس کا مطبوعہ نسخہ ہی کبھی دیکھا تھا، پہلے تو اس کا خاصا حصہ یاد تھا، اب کچھ یاد نہیں رہا، پھر فرمایا ہاں ایک شعر یاد آگیا اور شاید وہی آپ کے مقصد کے لیے کافی ہو گا وہ شعر یہ ہے فردوسی کے بارہ میں مصنف لکھتا ہے۔

دلش گبر و جاں گبر و گبری زباں زگبراں بگبری زباں قصہ خواں

بہرحال مولانا اپنے غیر معمولی حافظہ کے لحاظ سے اللہ کی قدرت کی ایک نشانی تھے۔

عہ مطلب یہ ہے کہ انسان جب زیادہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو حاصل علم بھی غائب ہو جاتا ہے۔

تحریر و تقریر کا امتیاز تحریر و تقریر بہت سادہ، ہر قسم کے تکلف و تصنع سے بری، حشو و زوائد سے پاک اور عبارت آرائی سے خالی مگر نہایت دلنشین ہوتی تھی، میں نے کسی صاحب قلم عالم کو نہیں دیکھا جس کی تحریر و تقریر میں اتنی یکسانی اور مطابقت ہو، اگر کوئی شخص مولانا کی تقریر لفظ بلفظ لکھتا تو اس کو کتابی شکل میں چھاپنے کے لیے کسی لفظی ترمیم کی بھی غالباً ضرورت نہ ہوتی، تقریر میں اثر اور زور پیدا کرنے کے لیے مولانا اس مبالغہ کے بھی روادار اور عادی نہیں تھے، جس کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح کمزور روایتیں (اگرچہ وہ علمی حلقوں میں بھی کتنی ہی مشہور ہو گئی ہوں) مولانا ان کے ذکر سے احتیاط فرماتے تھے۔ ہماری اسی صدی کے بہت بڑے حقانی عالم حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب محدث امروہوی (جن کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا) میں نے ایک مجلس میں اُن سے خود سنا حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ کے بارے میں فرماتے تھے کہ میں ان کی اس بات کا بہت ہی معتقد ہوں اور اس کو ان کی کرامت سمجھتا ہوں کہ وعظ میں بھی کوئی بات غیر تحقیقی بیان نہیں فرماتے۔

مناظرہ کا امتیاز قوت استدلال اور متانت و سنجیدگی آپ کے مناظرہ کا خاص امتیاز تھا، آپ کے متعدد مناظرے چھپے ہوئے ہیں، جن لوگوں نے کبھی آپ کا مناظرہ سنا ہے، وہ ان کتابی مناظروں کے مطالعہ کے وقت بالکل ایسا محسوس کریں گے کہ حضرت مولانا بول رہے ہیں۔ محقق مناظر کبھی غلط مبحث نہیں کرتا بلکہ اپنی پوری قوت اس پر صرف کرتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ روشنی میں آجائے، مولانا کا بالکل یہی طرز تھا، اسی لیے وہ فریق مخالف کی غلط مبحث کی کوششوں کو بھی چلنے نہیں دیتے تھے، اور وہ ہزار کوششوں کے باوجود غلط مبحث میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، بحث کے مرکزی نقطہ کو مولانا ہر تقریر میں ضرور دہرا دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عام سامعین کو بھی وہ خاص بات حفظ ہو جاتی تھی، فن کے لحاظ سے یہ مناظر کا کمال ہے اور احقاق حق کے مقصد کے لئے بھی یہ ضروری اور ناگزیر ہے۔

خاص موضوع اگرچہ حسب ضرورت مولانا نے مناظرے عیسائیوں سے بھی کیے، آریہ سماجیوں اور قادیانیوں سے بھی، اور ان کے علاوہ دوسرے فرقہائے ضالہ سے بھی، لیکن مولانا کا خاص موضوع شیعی حملوں سے صحابہ کرام اور مسلک اہل سنت کی حفاظت اور ان کا دفاع اور مذہب تشیع کی

ضلالتوں کو واضح کر کے حجت حق قائم کرنا تھا، اور یہ وہ موضوع ہے جو ہندستان کے خاص تاریخی حالات کی وجہ سے اس ملک کے اکابر علماء و مصلحین کی علمی اور دینی کوششوں کا صدیوں سے خاص موضوع رہا ہے ـــــ اب سے قریباً ساڑھے تین سو سال پہلے گیارہویں صدی ہجری میں تاریخ اسلام کے عظیم ترین مجدد امام ربانی شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد بارھویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے معاصر بیہقیٔ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد استاذ الہند شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور ان کے تلامذہ، اور اُن کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، الغرض اپنے اپنے زمانہ میں ان سب ہی حضرات کی دینی اور اصلاحی کوششوں کا خاص موضوع اور ہدف (اُن خاص تاریخی اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) یہی مسئلہ رہا ہے ـــــ جس شخص نے اس موضوع سے متعلق ان اکابر کی کتابیں دیکھی ہیں اور حضرت مولانا عبد الشکور صاحب نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے، اس کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ مولانا نے اس موضوع کو اپنے ان پیشرو اکابر سے کئی گنا زیادہ نکھارا، اور ایک سعادتمند پیرو کار کی طرح ان کے کام کی تکمیل کر کے ان کی روحوں کو شاد اور مطمئن کیا ـــــ اس ناچیز کا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا کی تحقیق و تنقیح نے اس دائرے کے کئی بنیادی مسئلوں کو جو علمی اور نظری تھے اور ان کو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے ایسا بدیہی بنا دیا کہ عامیوں کے لئے بھی ان کا سمجھنا آسان ہو گیا۔

ردِ شیعہ کے مشغلہ میں مولانا کی نیت اور اس موضوع سے ان کے غیر معمولی شغف کا اصل باعث	مولانا نے ایک صحبت میں مجھ سے خود فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے ناموس کی حفاظت اور ان کے خلاف کئے

جانے والے پروپیگنڈے کی تردید بجائے خود بھی عبادت بلکہ فریضہ ہے لیکن میں جو اس کام کو درجۂ اول کی اہمیت دیتا ہوں اور اس میں اس طرح مشغول ہوں، خدا گواہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے مجروح ہو جانے کے بعد قرآن مجید اور نبوت محمدی سب مشکوک ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ صحابۂ کرامؓ ہی کے واسطے سے جانتے ہیں، اگر اس سلسلہ کی پہلی کڑی اور دین کے ناقلوں کی پہلی صف ہی

ناقابلِ اعتبار ہو گئی تو قرآن اور سارا دین مشکوک ہو جائے گا۔ اور ہمارے پاس اُن کے بارہ میں یقین کی کوئی علمی بنیاد نہیں رہے گی۔ بہر حال میں صحابۂ کرامؓ کی یہ حمایت اور مدافعت اور ان کے دشمنوں کا یہ مقابلہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی نیت ہی سے کرتا ہوں اور مجھے اپنی مغفرت کی سب سے زیادہ امید اپنے اسی عمل سے ہے۔

غیر معمولی اعتدال مناظرہ کے میدان میں رہنے کے بعد راہ اعتدال پر قائم رہنا بڑی مشکل بات ہے، اللہ ہی اگر توفیق دے اور دستگیری فرمائے تو آدمی اعتدال پر قائم رہ سکتا ہے ورنہ اس میدان میں قدم رکھنے والے کا افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جانا ایک عام بات اور کثیر ی تجربہ ہے۔ ناچیز نے اس پہلو سے حضرت مولانا کو بہت ہی ممتاز اور با توفیق پایا۔ صرف ایک مقولہ نقل کرتا ہوں جو مولانا سے میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ ایک موقع پر حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درجات کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سابقین اولین کی پہلی صف کے بھی اکابر میں ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سرتاج ہیں لیکن حضرت علی مرتضیٰؓ سے ان کو کیا نسبت؟ ان کی مجلس میں اگر صفِ نعال میں بھی حضرت معاویہؓ کو جگہ مل جائے تو ان کے لئے سعادت اور باعث فخر ہے۔"

یہاں تک جن خصوصیات کا میں نے ذکر کیا ان کا براہ راست تعلق مولانا کی عالمانہ یا مناظرانہ حیثیت سے ہے، اگرچہ ان کی عارفانہ اور درویشانہ حیثیت کا بھی اُن میں خاصا حصہ ہے، اب دو چار باتیں میں وہ عرض کرتا ہوں جن کا تعلق خاص طور سے اس دوسری حیثیت سے ہے۔

نماز کے ساتھ قلبی تعلق اور نسبت نبوی نماز اس حیثیت سے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس گئی گزری حالت میں بھی ہر وہ مسلمان اس کا پابند ہے جس کو خوف خدا اور فکر آخرت کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہے۔ بہر حال اس حیثیت سے نماز ایک عوامی چیز ہے لیکن نماز کے ساتھ دل کا لگاؤ، اس کا کما حقہ اہتمام اور فکرمندی اور لوگوں میں نماز کی طرف سے بے التفاتی اور بے پروائی دیکھ کر دل کڑھنا اور بے چین ہونا بلاشبہ یہ کیفیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے بھی پہلے آپ کے جد امجد سیدنا خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خاص نسبت اور وراثت ہے انھوں نے

اپنے بیوی بچوں کو وادی غیر ذی زرع میں بسا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔

رَبَّنَآ اِنِّیۡٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (اے میرے پروردگار میں نے اپنی نسل کو تیرے مقدس و محترم گھر کے پاس بن کھیتی والی وادی میں بسا دیا ہے اے میرے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں۔)

اور عرض و معروض اور مناجات کے اسی سلسلہ کے آخر میں دعا کی تھی۔

رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ٭ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ ،

(میرے رب مجھے بنا دے نماز کا قائم کرنے والا اور میری نسل کو بھی یہ چیز نصیب فرما، پروردگار میری دعا قبول فرما)۔

اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت جو آخری وصیت امت کو فرمائی تھی اس میں سب سے پہلے نماز ہی کی تاکید تھی۔ بہرحال نماز کے ساتھ فکرمندی کا یہ تعلق اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم اور اس کے حبیب پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص وراثت ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو اس سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا، اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ ایک مدت تک مولانا کا یہ التزام رہا کہ ہر وعظ میں نماز کی تلقین وتاکید ضرور فرماتے تھے، بلکہ اس دور میں نماز ہی ان کے مواعظ کا خاص موضوع ہوتا تھا۔ اس عاجز نے خود بھی نماز کے بارے میں مولانا کا وعظ سنا ہے صاف محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ فرما رہے ہیں بے چین دل کی گہرائی سے فرما رہے ہیں۔ حضرت مولانا نے غالباً اسی زمانہ میں نماز کے موضوع پر ایک بڑی موثر مستقل کتاب بھی "کتاب الصلوٰۃ" کے نام سے لکھی تھی، اس میں مولانا نے قرآن مجید کی ایک سو ایک آیات نماز سے متعلق جمع فرمائی ہیں، اس عاجز کو اعتراف ہے کہ مولانا کی اسی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں کن کن عنوانات سے نماز کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کتاب میں آیات کے علاوہ نماز سے متعلق تاکیدی اور ترغیبی ترہیبی حدیثیں بھی اور آخر میں ائمہ امت کے ارشادات بھی ذکر فرمائے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کتاب نہایت موثر ہے اور علمی حیثیت سے بھی اس کا پایہ بلند ہے، مجھے کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی اس کتاب کی یا اس کے کسی حصہ کی کتابت بھی خود ہی فرمائی تھی (حضرت مولانا

نہایت جمیل الخط تھے اور بدخط تحریر سے گرانی ہوتی تھی)۔۔۔۔۔ لکھنؤ کے متعدد واقف حضرات سے میں نے سُنا ہے کہ یہاں نماز کا رواج بہت کم تھا، بہت سی مسجدیں غیر آباد تھیں، الحمد للہ اب یہ بات نہیں ہے، ان حضرات نے بتایا کہ اس میں سب سے بڑا دخل حضرت مولانا مرحوم کے مواعظ کا ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق

اس سے ملتی جلتی دوسری قابل ذکر خصوصیت قرآن مجید کے ساتھ حضرت مولانا کا خاص شغف اور تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے چھ صاحبزادے عطا فرمائے (جنمیں سے دو کا سانحۂ انتقال ہو چکا ہے) مولانا نے ان سب کو قرآن مجید حفظ کرایا[1] ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا وہی کرے گا جس کو اللہ کی کتاب پاک کے ساتھ غیر معمولی شغف ہو، مولانا پہلے خود حافظ قرآن نہیں تھے لیکن اب سے چند ہی سال قبل بالکل بڑھاپے کے دور میں خود محنت کر کے حفظ کیا اور زندگی کے ان چند اخیر سالوں میں تو بس تلاوت قرآن ہی ان کا دن رات کا شغل اور وظیفہ تھا گزشتہ آٹھ دس سال میں صبح یا شام جس وقت بھی حاضری کا اتفاق ہوا یہی دیکھا کہ قرآن مجید سامنے ہے اور اسکی تلاوت میں مشغول ہیں حالت یہ ہو گئی تھی کہ اپنے خاص اہل محبت اور نیازمندوں تک کا زیادہ آنا اور دو چار منٹ سے زیادہ بیٹھنا باعث گرانی ہونے لگا تھا، اس گرانی کا اظہار زبان سے تو میں نے کبھی نہیں سُنا لیکن دو تین ہی منٹ کے بعد چہرے سے محسوس ہونے لگتا تھا کہ انھیں شغل تلاوت کا یہ انقطاع شاق ہو رہا ہے اور وہ منتظر ہیں کہ آنے والا رخصت ہو تو وہ اپنے شغل میں مشغول ہوں۔

اہل وعیال سے محبت اور ان کی جدائی پر صبر والی نبوی وراثت

اپنے اہل وعیال سے محبت بھی انسانی فطرت کا تقاضہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہے۔ حدیث وسیرت پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال اور مقام تھا کتب حدیث میں مذکور ہے کہ نواسوں اور نواسیوں میں سے کوئی بچہ منبر پر خطبہ دیتے وقت قریب آگیا تو آپ نے اسی حالت میں اسے گود میں اٹھا لیا بلکہ کبھی کبھی تو انھیں گود میں لے کر آپ نے نماز بھی پڑھی ہے۔ اسی طرح ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کی ملاطفت اور حسن معاشرت مثالی تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وراثت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اولاد اور اولاد کی اولاد کے ساتھ آپ کے دل کا لگاؤ بھی مثالی تھا

---

[1] بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے دو بھائی اپنی بیماری وغیرہ کی وجہ سے پورا قرآن مجید حفظ نہیں کر سکے تھے، اگرچہ حضرت مولانا نے اس کے لیے پوری کوشش فرمائی۔ ۱۲

لیکن دو جوان صاحبزادوں (مولانا حافظ عبدالغفور صاحب مرحوم اور مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب مرحوم) اور جوان العمر اکلوتی بیٹی صاحبزادی اور ان سے پہلے ان کی والدہ مرحومہ کے انتقال کے وقت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال اور ارشاد کا کامل نمونہ دیکھا گیا جو عہد نبوت کے اکلوتے صاحبزادے سیدنا ابراہیم (علیٰ ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وفات کے وقت آپ کا حال اور قال دیکھا اور سنا گیا تھا، حدیث شریف میں ہے کہ ان کے انتقال پر آپ نے فرمایا۔

العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی ربنا انا للہ وانا الیہ راجعون — آنکھ آنسو بہا رہی ہے اور دل کو رنج اور صدمہ ہے اور زبان وہی بولے گی جس سے میرا مالک راضی ہو۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"

ایک عارف کامل کی شہادت آخر میں اس دور کے ایک مسلّم عارف بلکہ یقین و معرفت کے امام حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ارشاد پر تاثرات کے اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا اپنے وصال سے ٹھیک ایک سال پہلے رجب ۱۳۶۲ھ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور قریباً ایک ہفتہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں قیام فرمایا تھا، ایک روز دار العلوم کی مسجد کے وضو خانہ میں وضو فرما رہے تھے، دار العلوم کے دو تین اساتذہ بھی ساتھ بیٹھے وضو کر رہے تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندوی (موجودہ ناظر شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء) مولانا کے بالکل سامنے بیٹھے وضو کر رہے تھے جن پر حضرت مولانا کی ان پر شفقت و عنایت کی خاص نظر تھی، اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا "میاں مولوی معین اللہ! حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا، ہاں حضرت جانتا ہوں، زیارت بھی کی ہے۔ فرمایا "نہیں تم نہیں جانتے۔" پھر فرمایا "وہ امام وقت ہیں" —

لکھنؤ کے اسی سفر میں ناچیز راقم سطور بھی حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ہمرکاب تھا، ایک صحبت میں (اب یاد نہیں کس سلسلہ میں) خود مجھ سے فرمایا کہ ان مشرقی دیار میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کا وہی مقام ہے جو ہمارے مغربی دیار میں ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ (حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ کا وصال چند ہی روز پہلے ہو چکا تھا۔) آخر میں ناچیز راقم سطور اپنے ناظرین سے خصوصیت کے ساتھ درخواست کرتا ہے کہ حضرت مولانا کے لیے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی اور تمام محبین و متعلقین کے لیے صبر و اجر اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی خاص طور پر دعا فرمائیں، یہ اُن کا اس ناچیز پر ذاتی احسان ہوگا۔

محمد منظور نعمانی

مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہ

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

(ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

الفرقان کے ناظرین میں شاید کوئی ایک بھی نہ ہوگا جو اس دور کے امام یقین و معرفت مرشدنا حضرت رائے پوری کے نام نامی سے ناواقف ہو، اور غالباً سبھی کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہو چکا ہوگا کہ اسی ماہ مبارک ربیع الاول کی ۱۴ر تاریخ کو (مطابق ۱۶ر اگست ۱۹۶۲ء) دن کے قریباً ساڑھے گیارہ بجے لاہور میں حضرت کا وصال ہو گیا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ عبادہ المحسنین المخلصین۔

راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اللہ کی توفیق سے قریباً بیس سال سے جو نیاز مندانہ اور مسترشدانہ تعلق و ارتباط حضرت کے آستانہ عالی سے نصیب تھا اس کا حق تھا کہ الفرقان میں ہمیشہ حضرت کے حالات و افادات شائع ہوا کرتے لیکن چونکہ یہ بات معلوم تھی کہ اپنے نیاز کیشوں اور عقیدت مندوں کا حضرت کے بارے میں اخبارات و رسائل میں کچھ لکھنا اور ایک صاحب ارشاد شیخ وقت کی حیثیت سے تذکرہ کرنا حضرت کے لیے گرانی ہی نہیں بلکہ اذیت کا بھی باعث ہوتا ہے[1]۔ (اور اپنے

---

[1] اس معاملہ میں خود اپنے اکابر کو مختلف الحال دیکھا ہے، بعض حضرات اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے کہ ان کے اچھے حالات اور ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی اشاعت کا دائرہ وسیع ہو، اور بلاشبہ اس میں خیر کا یہ پہلو ضرور ہے کہ یہی چیز بہت سے بندوں کے لیے واقفیت اور پھر طلب و توجہ کا ذریعہ بن جاتی ہے، لیکن بعض حضرات پر "فنائیت" اور "میں کچھ بھی نہیں" کے احساس کا غلبہ ہوتا ہے، وہ اپنے کو اس درجہ سراپا قصور سمجھتے ہیں کہ ہر سچی تعریف اور واقعی حالات کا تذکرہ بھی غلط بیانی (باقی حاشیہ صفحہ پر)

اس تعلق سے پہلے ہی ۱۳۵۵ھ میں گویا اب سے ۴۴-۴۵ سال پہلے اس کا ایک تجربہ بھی ہو چکا تھا) اس لیے اس پوری مدت میں جہاں تک یاد ہے حضرتؒ سے متعلق الفرقان میں کبھی کچھ نہیں لکھا جا سکا، اب جبکہ حضرت کا وصال ہو چکا ہے اور مجبوری باقی نہیں رہی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

یا غلط قسم کا مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ یا حسن خاتمہ کے بارے میں موت تک فکر و اضطراب کے غلبہ کی وجہ سے وہ اس کے روادار نہیں ہوتے کہ زندگی میں ان کے ایمانی کمالات کا چرچا کیا جائے عصر حاضر ہی کے ہمارے ایک بزرگ جن سے اس عاجز کو عقیدت و محبت نصیب ہے (اور جو خوش قسمتی سے ہماری اس دنیا میں ابھی رونق افروز ہیں) اس عاجز نے ایک دفعہ چاہا کہ ان کے بارے میں اپنے بعض خاص معلومات "الفرقان" میں لکھ دے تاکہ اللہ کے بندے ان کے مقام سے واقف ہو کر حسب توفیق استفادہ کر سکیں لیکن وہ کسی طرح اس کی اجازت دینے پر راضی نہیں ہوئے، اور من جملہ اور وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی لکھی کہ جب تک ایمان پر خاتمہ نصیب نہ ہو جائے کسی چیز کا کوئی اعتبار نہیں اور یہاں تک لکھ دیا کہ اگر میرے متعلق یہ باتیں لکھی گئیں تو صرف یہی نہیں کہ میری مرضی کے خلاف ہو گا بلکہ مجھے اذیت بھی ہو گی۔

بہر حال خاصانِ خدا میں سے بہت سوں کا ایک حال یہ بھی ہوتا ہے اور مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہ کا حال یا ذوق بھی یہی تھا۔ ۱۳۵۵ھ میں اب سے گویا ۴۴-۴۵ سال قبل، یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک خاص مقصد کے تحت حضرت کی خدمت میں رائے پور حاضر ہوئے تھے اس وقت ہمارا حضرت سے کوئی خاص ربط و تعلق نہیں تھا، صرف دور کی کچھ واقفیت تھی، ہم اس سفر میں چند اور دینی مرکزوں میں بھی گئے تھے۔ واپسی پر مولانا ندوی نے اس سفر کی روداد لکھی جو الفرقان میں شائع ہوئی اس میں رائے پور کی حاضری کا بھی ذکر تھا اور حضرت کے بارے میں موصوف نے اپنے خاص تاثرات بھی لکھے تھے جو صرف ایک عام زائر اور اجنبی مسافر کے تاثرات تھے، الفرقان رائے پور کی خانقاہ میں جاتا تھا، جب حضرت کی نظر سے وہ مضمون گذرا تو آپ نے خط لکھا جس سے معلوم ہوا کہ اپنے بارے میں اس طرح کی تحریریں نہ صرف یہ کہ حضرت کو ناپسند ہیں بلکہ ان سے قلب مبارک پر گرانی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تجربہ کے بعد حضرت کے بارے میں کچھ لکھنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی تھی۔

ہے کہ "اذکروا محاسن موتاکم" (دنیا سے چلے جانے والے اپنے لوگوں کے اچھے حالات اور اچھی باتوں کا تذکرہ اور چرچا کرو) تو اپنے دل حزیں کی تسکین ہی کے لیے چند سطریں حضرت کے بارے میں لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ ع

خاطر خود را تسلی میدہم

دین میں تزکیۂ باطن اور اخلاص و احسان کی جو اہمیت ہے اور اس شعبہ کے سنبھالنے والے ائمہ ارشاد اور مشائخ ربانیین کا جو مقام اور ان کی جو امتیازی حیثیت ہے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "تفہیمات الٰہیہ" کی پہلی ہی تفہیم میں اس کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

"انبیاء علیہم السلام جن چیزوں کی خصوصیت سے دعوت دیتے ہیں وہ بنیادی طور پر تین ہی چیزیں ہیں۔

ایک مبداً و معاد وغیرہ سے متعلق عقائد کی تصحیح!

اس شعبہ کو علمائے عقائد و اصول نے سنبھال لیا ہے۔

دوسرے عبادات اور معاملات و معاشرت وغیرہ انسانی اعمال کی صحیح صورتوں کی تعلیم، اس شعبہ کی کفالت فقہائے امت نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔

تیسرے اخلاص و احسان: (یعنی ہر کام خالصًا لوجہ اللہ اور اس دھیان کے ساتھ کرنا کہ میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے۔)

اور یہ تیسری چیز دین و شریعت کے مقاصد میں سب سے دقیق اور عمیق ہے اور پورے نظام دینی میں اس کی حیثیت وہ ہے جو جسم میں روح کی اور الفاظ کے مقابلہ میں معنی کی! اور اس شعبہ کی ذمہ داری صوفیائے کرام رضوان اللہ علیہم نے لے لی ہے، وہ خود راہ یاب ہیں اور دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں، خود سیراب ہیں اور دوسروں کو سیراب کرتے ہیں، وہ بڑے بانصیب اور انتہائی سعادت مند ہیں۔

اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیت یہ ہے کہ اس امت کے علمائے ربانی جو ختم نبوت کے بعد انبیاء علیہم السلام کے وارث اور ان کے ترکہ کے امین ہیں وہ اس "نور" کی حفاظت و اشاعت کے لیے جو انبیاء علیہم السلام سے انکو ملا ہے برابر سعی کرتے رہیں اس لیے اس طبقہ میں

سلسلہ یہ دستور چلا آرہا ہے کہ یہ حضرات اپنے مستفیدین و مسترشدین میں سے جن کو اس منصب کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل سمجھتے ہیں ان کو "خلیفہ" مقرر کرتے ہیں اور ان کے علاوہ دوم سوم درجہ کے لوگوں کو بھی اس راہ کا "داعی" بنا کر بھیجتے ہیں تا کہ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام جس کام کے لیے آئے تھے وہ جاری رہے اور "اِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کا منشور ربانی پورا ہو۔

(تفہیمات الٰہیہ ص۲۱۲-۱۳ ملخصاً)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس کلام سے ائمہ ارشاد و سلوک کے کام و مقام پر اچھی روشنی پڑ جاتی ہے اور اس سلسلہ میں جو تشکیلات یعنی خلیفہ بنانے یا اجازت دینے کا ان حضرات کا جو دستور و معمول ہے اس کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔

ہمارے حضرت قدس سرہ کا اصل کام و مقام یہی تھا، اور اپنے شیخ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہ کے حکم سے اپنے کو سب طرف سے یکسو کر کے اسی خدمت پر لگا دیا تھا، حضرت نے پہلے درس نظامی کی باقاعدہ تکمیل کی تھی اور اس دور کے رواج کے مطابق فنون عقلیہ منطق و فلسفہ پر خاص محنت کی تھی، ایک عرصہ تک مختلف مقامات پر درس بھی دیا تھا آخر میں جب بریلی میں درس و تدریس ہی کے سلسلہ میں قیام تھا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب المنقذ من الضلال[1] کا مطالعہ کیا، فی الحقیقت تو صرف عنایت ربانی تھی لیکن بظاہر اس کتاب کا مطالعہ ہی اس کا سبب بنا کہ دل میں جذبۂ طلب حق کا وہی شعلہ بھڑک اٹھا جس نے امام غزالی کو "نظامیہ بغداد" کی مسند صدارت سے اٹھا کر (جس کا درجہ عزت و عظمت کے لحاظ سے اس وقت وزارت سے کم نہ تھا) برسوں راہ حق میں سرگرداں پھرایا تھا۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد آپ درس و تدریس کے شغل کو خیرباد کہہ کر بریلی سے نکل کھڑے ہوئے لمبے لمبے پاپیادہ سفر کیے، مدتوں ٹھوکریں کھانے کے بعد (جو "عشق" کے گویا لوازمات میں سے ہے) رحمت حق نے دستگیری فرمائی، اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری (نور اللہ مرقدہ) کی جو خانقاہ آپ کے استفادہ اور پھر افادہ کے لیے ازل سے مقرر ہو چکی تھی وہاں آپ کو پہونچا دیا گیا۔ (خود حضرت کی زبان مبارک سے اس دورِ حیاتی مدت کے بڑے بڑے سبق آموز ابتلائی واقعات بھی سنے ہیں لیکن وہ مستقل سوانح حیات میں آنے والی چیزیں ہیں۔)

رائے پور کی خانقاہ میں پہونچ کر آپ کو جلد ہی یقین و اطمینان نصیب ہو گیا کہ میں جس چیز کی

---

[1] یہ کتاب ایک طرح سے امام غزالی کی آپ بیتی ہے اور اس کا پیغام یہ ہے کہ تعلق باللہ اخلاص و احسان کی یافت کے بغیر کتابی علم ہیچ بلکہ ایک طرح کا فریب ہے۔

تلاش میں ہوں وہ یہاں موجود ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت دوسرے معاصر اکابر و مشائخ حق کے علاوہ خود حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے شیخ قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ بھی دنیا میں رونق افروز تھے اور گنگوہ کا بازارِ عشق و محبت پوری طرح گرم تھا، اور بیعت کی پہلی درخواست کے جواب میں خود شیخ نے آپ کو بھی گنگوہ حاضر ہونے کا مشورہ دیا تھا، لیکن آپ نے اپنے خاص حالات اور اپنی مناسبت کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے اپنے بارے میں یہی فیصلہ کیا کہ "جا اینجا است"۔

فرماتے تھے کہ شروع میں حضرت نے مجھے بیعت نہیں فرمایا بلکہ ذکر کی تلقین فرمادی اور کافی مدت (غالباً دو برس) کے بعد بیعت فرمایا ـــــــ یہ زمانہ رائے پور کی اس خانقاہ کے مقیمین کے لیے بڑے عُسر، بڑے مجاہدے اور بڑی سختی کا تھا، فرماتے تھے کہ مسلسل دس سال ایسے گذرے ہیں کہ ہم لوگوں کو جو طالبین کی حیثیت سے خانقاہ میں رہتے تھے، ایک دن میں صرف ایک روٹی مکئی کی ملتی تھی اور وہ بھی درمیان سے بالکل کچی ہوتی تھی، جو صاحب پکانے والے تھے انھیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ روٹی سکی یا نہیں سکی۔ سالن یا دال ترکاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، گاؤں سے کسی دن چھاچھ آجاتی تو کھانے پینے کے لحاظ سے ہم خانقاہ والوں کے لیے گویا وہ عید کا دن ہوتا۔ فرماتے تھے اس علاقہ کے (یو، پی کے) ہمارے ساتھی تو وہی ایک روٹی آدھی آدھی کر کے دونوں وقت کھاتے تھے لیکن میں پنجاب کا رہنے والا تھا اس لیے ایک ہی وقت میں کھا لیتا تھا اور دوسرے وقت بس اللہ کا نام![1]

---

[1] جس خانقاہ میں ۵۰، ۶۰ سال پہلے یہ عُسرہ اور فقر تھا وہاں ان آخری سالوں میں سب ہی آنے جانے والوں نے دیکھا کہ ایک ایک وقت میں سو سو دو دو سو مہمان ہیں اور سب کو اچھا خاصا کھانا دونوں وقت کھلایا جارہا ہے، بلکہ رمضان مبارک میں تو دودھ بھی پابندی کے ساتھ سب کو مل رہا ہے، جو اچھی چائے پینے کے عادی ہیں اُن کو اُن کے معیار کے مطابق دو دو تین تین دفعہ چائے مل رہی ہے ــــ اب سے چار یا پانچ سال پہلے کی ایک دن کی بات ہے ہم دونوں (یعنی یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی) بھی حاضر تھے، لگ بھگ سو مہمان ہوں گے، دسترخوان پر خود میں نے گنا چار قسم کی تو صرف کھیر تھی، تین قسم کی مچھلیاں تھیں گوشت بھی کئی قسم کا تھا، یہ سب قرب و جوار کے دیہات کے حضرت کے محبین و مخلصین حضرت کے مہمانوں ہی کی نیت سے خود اپنے گھروں سے پکوا کے لے آتے تھے اور رائے پور کے خوش نصیب بھائی تو روزانہ ہی اپنے گھروں سے ناشتہ دانوں میں بھر بھر کے کئی کئی قسم کے کھانے لاتے تھے ــ "إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" کا یہ ظہور ادھر چند برسوں سے مسلسل ہو رہا تھا ــ حق ہے "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ"

لیکن یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جب حضرت اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے خود اس میں سے کچھ بھی نہیں کھا سکتے تھے۔

فرماتے تھے کہ اس زمانہ میں مسلسل اس کچی روٹی کے کھانے کی وجہ سے پیٹ اور آنتوں میں جو تکلیف پیدا ہوگئی تھی اس کے اثرات اب تک ہیں ——— اس غذا کے ساتھ ذکر اور بالجہر ذکر اس مقدار میں ہوتا تھا جس کا ہم کم ہمتوں کے لیے تصور بھی مشکل ہے ——— فرماتے تھے کہ ضعف دماغ کی وجہ سے ذکر کے وقت ناک سے ریزش ٹپکتی رہتی تھی، میں موٹے گاڑھے کا ایک رومال اپنے زانوؤں میں ڈال لیتا جو ریزش سے تر بتر ہو جاتا تھا اور میں روزانہ اس کو دھوکر سکھا لیتا تھا ذکر ختم کرکے جب حجرہ سے نکلتا تھا تو کچھ دیر تک آنکھوں کے آگے اندھیرا سا رہتا تھا اور میں کسی سے بات کرنے کے قابل نہیں ہوتا تھا ——— اس درمیان میں اللہ تعالیٰ کا جو فضل ہوتا رہا، ہم خدام کی ترغیب و تشویق کے لیے کبھی کبھی وہ بھی ذکر فرمایا۔

گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں گاہ بگاہ حضرت سے جو کچھ سُنا، اس سے اس ناداں اور ناسمجھ نے تو بس یہی سمجھا کہ شریعت کے عام اوامر و نواہی کی پابندی کے علاوہ تقرب الی اللہ کی فضاؤں میں حضرت کی پرواز کے دو ہی خاص بازو تھے۔ ایک ظاہر و باطن سے اللہ کے ذکر کی کثرت، دوسرے اپنے شیخ سے غایت تعلق اور محبت!

اپنے شیخ کے وصال کے بعد[1] انھیں کے حکم کے مطابق آپ وہیں پڑ گئے اور ان کی جلائی ہوئی شمع کو پورے ۵۹ سال تک روشن رکھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس روشنی کا حلقہ آپ کے ذریعہ اتنا وسیع کیا جس کا پہلے شاید تصور بھی نہ ہوگا۔ حضرت کے ہاتھ پر توبہ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے کم نہ ہوگی، آخری ایام میں تو ایک ایک دن میں کئی کئی سو بیعت و توبہ کے لیے آتے تھے، یہاں تک کہ بسا اوقات سیکڑوں کے مجمع کو ایک ساتھ سامنے بٹھا کر کسی دوسرے بلند آواز خادم کی وساطت سے توبہ اور بیعت کے کلمات حضرت تلقین فرماتے تھے اور بس اسی طرح مجموعی بیعت ہوتی تھی۔

آپ کے وابستگانِ دامن اور فیضیافتگان میں بہت بڑی تعداد ان خوش نصیب بندگان خدا کی بھی ہے جنھیں اپنی محنت و مجاہدہ اور اپنی اپنی استعداد و نصیب کے مطابق الحمد للہ بہت کچھ حاصل ہوا۔

اہل اللہ کے طرز و انداز اور ان کے الوان و اذواق مختلف ہوتے ہیں۔ ؏

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

---

[1] شیخ ربانی حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کا وصال ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء سہ شنبہ میں ہوا تھا۔ ۱۲

حضرت کا معاملہ یہ تھا کہ ایسی باتیں خاص کر عام مجالس میں بہت ہی کم فرماتے تھے جن سے کوئی آپ کو صاحب مقام بزرگ سمجھ سکے، بلکہ اکثر یا تو بالکل خاموش رہتے یا ایسی باتیں زیادہ فرماتے جن سے بظاہر بزرگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا، اب سے چند سال پہلے تک یہ عاجز جب حاضر خدمت ہوتا تو طرح طرح سے اس کی کوشش کرتا کہ حضرت ایسی باتیں بالکل نہ فرمائیں۔ بلکہ بس بزرگوں ہی والی باتیں فرمائیں تاکہ ہر آنے والا متاثر ہو اور معتقد بنے اور طالب بن کر دینی نفع حاصل کر سکے۔ اس غرض کے لیے میں سوالات کر کر کے ایسی ہی باتیں حضرت سے کرانے کی کوشش کرتا لیکن اس میں پوری طرح کبھی کامیاب نہ ہو سکتا۔ مجلس میں جس رنگ ڈھنگ کا کوئی آدمی آجاتا آپ اُس سے اُسی طرح کی باتیں شروع فرما دیتے۔ بعض وقت تو مجھے اپنی نادانی اور حماقت سے اس صورت حال سے سخت انقباض ہو جاتا کیونکہ میں یہ چاہتا تھا کہ یہاں جو آئے وہ حضرت کی بزرگی کا فوراً ہی قائل اور معتقد ہو جائے اور فیض حاصل کرے، لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ سب میری نادانی اور حقیقت ناشناسی تھی حضرت باتوں سے معتقد بنانے کے قائل نہ تھے۔ دوسری بات عرصہ کے بعد یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اگر حضرت میری منشا کے مطابق بس بزرگانہ ہی باتیں فرمایا کرتے تو بہت سے آزاد مزاج ہمارے دوست جو آج ماشاء اللہ ذاکر شاغل ہیں، حضرت سے جوڑ نہ کھا سکتے، اور شاید ان کی زندگیاں آوارگی ہی میں گذرتیں، علاوہ ازیں اس طرز عمل میں غالباً اس کو بھی کچھ دخل تھا کہ حضرت پر نفی اور فنائیت کا غلبہ تھا، واللہ اعلم۔

حضرت کے اس طرز عمل ہی کی وجہ سے عوام تو عوام بعض خواص نے بھی اس ناچیز سے اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے کبھی کبھی سوال کیا کہ آپ لوگوں نے حضرت میں کیا دیکھا؟ —— یہ ناچیز بیس سالہ تعلق کے باوجود کچھ نہ کرنے کی وجہ سے اگرچہ خود محروم اور بالکل ہی محروم رہا، لیکن الحمد للہ اتنا تو بلا کسی مبالغہ کے کہہ سکتا ہے کہ اپنے خیال میں تو کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو اللہ کے لیے مٹنے والے بندوں میں ہونی چاہیے اور اپنی عامیانہ آنکھوں نے حضرت میں نہ دیکھی ہو، لیکن اس عاجز نے جن چیزوں کو زیادہ محسوس کیا ان میں سے ایک تو ہے حضرت کا وہ توکل اور تبتل جو کامل یقین اور وصول ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، جو شخص حضرت کے قریب صرف

چار دن بھی رہا ہوا ور اُسے ان باتوں کا کسی درجہ میں کچھ بھی شعور ہو وہ کھلی آنکھوں اس کو دیکھ سکتا تھا ــــــ دوسری چیز جس سے یہ عاجز اس سے بھی زیادہ متاثر ہے وہ ہے حُبِّ جاہ کا ایسا قلع قمع جس سے آگے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ الحمد للہ ہمیں حضرت کے کشف و کرامات کا بھی تجربہ ہوا لیکن بخدا ہزار کھلی کرامتیں اس نعمتِ عظمیٰ کے برابر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی کو حب جاہ کے جذبہ سے پاک وصاف کر دے، سلوک و تصوف کے اکابر ائمہ کا گویا ایک مسلمہ ہے "آخر ما یخرج من قلوب الصدیقین حب الجاہ" (طالبین وسالکین ہی نہیں بلکہ صدیقین کے بھی قلوب کا وہ روحانی مرض جو سب سے آخر میں نکلتا ہے حب جاہ کا جذبہ ہے)

جہاں تک اپنا بشری اندازہ ہے ہم نے یہی دیکھا اور محسوس کیا کہ گویا حب جاہ کا بالکل ہی سر کچلا ہوا ہے اور اس میں کہیں کوئی رمق بھی زندگی کی نہیں ہے، یہ عبدیت کی تکمیل ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں۔

آخری مرض کا سلسلہ اور وصال

اب سے قریباً آٹھ سال قبل جب کہ حضرت کا قیام کوہ مسوری پر اپنے نہایت عزیز نیاز مند شاہ محمد مسعود صاحب کی کوٹھی پر تھا، پہلی دفعہ دل کا دورہ پڑا اور سخت خطرہ کی حالت پیدا ہو گئی لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور طبیعت اس وقت سنبھل گئی، مگر اس کے بعد سے کچھ نہ کچھ اثر اس کا ہمیشہ رہا، اس درمیان میں کئی دفعہ خطرناک دورے بھی پڑے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے حالت ہر دفعہ سنبھل گئی، قریباً آٹھ سات سال کی یہ پوری مدت اسی مدوجزر میں گذری اسی حالت کی وجہ سے کئی سال سے نماز بھی بیٹھ کر اشارہ ہی سے ہوتی تھی۔ پوری طرح رکوع سجود نہیں فرما سکتے تھے۔ چونکہ حضرت کے خدام اور فیض یافتگان کی بہت بڑی تعداد پاکستان میں ہے اور اصل وطن بھی وہیں ضلع سرگودھا میں ہے اور الحمد للہ قریبی اعزہ حقیقی بھائی بھتیجے وغیرہ بھی موجود ہیں اس وجہ سے اس نازک حالت میں بھی کئی بار پاکستان تشریف لے گئے اور طویل طویل مدت تک وہاں قیام فرمایا۔

اب سے قریباً دو سال پہلے جب آخری مرتبہ حضرت وہاں سے تشریف لائے تو حضرت کے

ضعف کو دیکھ کر عام اندازہ یہ تھا کہ اب غالباً حضرت کبھی پاکستان تشریف نہ لیجا سکیں گے اور وہاں کے مخلصین بھی شاید اس حالت میں اب سفر پر اصرار نہ کریں گے۔ لیکن چونکہ دونوں حکومتوں نے ویزا کے مسئلہ میں سخت مشکلات پیدا کر رکھی ہیں اور وہاں سے کسی کا یہاں آنا اور اسی طرح یہاں سے کسی کا وہاں جانا مشکل ترین مسئلہ بن گیا ہے جس کی وجہ سے حضرت کے اہل محبت اور قریبی اعزہ کو بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے میں سخت مشکلات تھیں اس لیے وہ حضرات صبر نہ کر سکے اور اصرار کا سلسلہ جاری رہا، حضرت بھی ان کے تعلق اور محبت کا حق محسوس فرماتے تھے اس لیے انتہائی ضعف کی حالت میں بھی تشریف لے جانے کا فیصلہ فرمالیا اور گذشتہ مئی میں تشریف لے گئے، اس دفعہ حضرت کی طبیعت زیادہ تر ناساز رہی۔ ۲۶ر جولائی شنبہ کے دن شیخ الحدیث مخدومنا حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہٗ کا والا نامہ رفیق محترم مولانا ندوی کے نام آیا جس سے معلوم ہوا کہ ۲۴ر جولائی جمعرات کے دن حضرت شیخ کو لاہور سے تار ملا ہے کہ حضرت کا مزاج زیادہ ناساز ہے، مولانا اسی دن شام کو لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس عاجز کو ہماری سرکار نے پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا ہے اس لیے ناچیز کے لیے کوئی صورت وہاں حاضری کی نہ تھی۔ اور یہ محرومی بھی مقدر تھی۔ رفیق محترم مولانا ندوی جب حضرت کی خدمت میں پہونچے ہیں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی، یہانتک کہ حضرت نے کچھ بات بھی فرمائی اور مولانا نے اسی دن اس عاجز کو اطمینان کا خط لکھا اس سے ایک دن پہلے مولانا عبد الجلیل صاحب بھی ایسا ہی خط لکھ چکے تھے لیکن چند روز کے بعد مرض کا پھر غلبہ ہو گیا، کئی دن مسلسل غشی کی سی کیفیت رہی بالآخر ۱۴ر ربیع الاول بروز پنجشنبہ ۱۱ بجکر ۵ منٹ پر روح مبارک دوسرے عالم کی طرف پرواز کر گئی اور پنجشنبہ و جمعہ کی درمیانی شب میں اپنے وطن عزیز میں تدفین ہو گئی ــــ جاءت بہ منیتہ الی تربتہ، یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ ــــــ

نماز جنازہ ۴ دفعہ ہوئی پہلی لاہور میں، دوسری لائلپور میں، تیسری سرگودھا میں، چوتھی خاص وطن ڈھڈیاں ضلع سرگودھا میں۔ یوں تو خدام و متوسلین کی ایک دنیا ہے جو تعزیت کی مستحق ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت کے خاص اعزہ بالخصوص مولانا عبد الجلیل و مولانا عبد الرحمٰن و مولانا عبد الوحید صاحب وغیرہ اور حضرت کے وہ خدام اور اپنے وہ اخوان و احباب جو حضرت ہی کے قدموں

سے وابستہ ہو گئے تھے اور حضرت ہی کے آستانہ کو انھوں نے اپنی دنیا بنا لیا تھا تعزیت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں ان حضرات کی خدمت میں عرض کرنا ہے اور اپنے دل سے بھی کہنا ہے ——

ان فی اللہ عزاءً من کل مصیبۃ ودرکا من کل فائت فباللہ فثقوا وایاہ فارجوا فانما المصاب من حرم الثواب ——

انشاء اللہ حضرت کی مستقل سوانح ضرور لکھی جائے گی اور غالباً یہ سعادت رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حصہ میں آئے گی ھو احق بہ واھلہ یہ سطریں تو اس عاجز نے بس اپنی تسکین خاطر کے لیے لکھی ہیں —— ع —— خاطر خود را تسلی میدہم

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

حضرت رائے پوری قدس سرہ کے وصال کے علاوہ اس مہینے کا ایک بڑا اہم ملی حادثہ جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ اور روح رواں مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہے۔ مولانا کی وفات سے صرف جمعیۃ علمائے ہند کی بزم ہی سونی نہیں ہوئی بلکہ مسلمانان ہند کے ایک نڈر، بے باک، سرگرم اور جانباز خادم کی آواز خاموش ہو گئی —— مولانا نے ملک کی آزادی کے بعد کے پندرہ سال میں ملت کی جو خدمت کی اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بلا شبہ وہ اس خدمت میں فرد فرید تھے اور آج کوئی ان کا بدل ملت کے پاس نہیں ہے۔

اللہ کی مشیت ہے ایک عجیب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ ہر ہر شعبہ کی اہم اہم ہستیاں اٹھتی جا رہی ہیں اور گویا کوئی بھی اپنا کوئی بدل نہیں چھوڑ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان صدمات کے اجر سے محروم نہ کرے اور مرحومین کو اپنی رحمت خاص سے نوازے۔

مولانا کی وفات کا حادثہ اس عاجز کے لیے ایک ذاتی حادثہ کی نوعیت بھی رکھتا ہے۔ ان کی وفات سے ایک بڑے مخلص اور مہربان دوست سے محروم ہو گیا۔ مولانا کے متعلق اپنے تفصیلی تاثرات میں ہفت روزہ ندائے ملت میں لکھ چکا ہوں[1] اس لئے یہاں اس مختصر تذکرہ ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ ناظرین سے التماس ہے کہ وہ مولانا کی مغفرت اور رفع درجات کے لیے دعا فرمائیں۔

---

[1] ندائے ملت میں شائع شدہ مضمون انشاء اللہ الفرقان کے آئندہ شمارہ (جولائی ۱۹۷۳ء) میں شائع کر دیا جائے گا۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ

"چند نقوش و تاثرات"

(شوال ۱۳۸۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

اسی رمضان المبارک (۱۳۸۱ھ) کے وسط میں مشہور عالم ربانی حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ اُن کے متعلق بہت کچھ لکھا جائے گا اور ان کے تلامذہ، معتقدین اور واقفین کی زبان سے بہت سے ایسے حالات اور کمالات معلوم ہوں گے جن کی دُنیا کو خبر نہیں، مولانا کی زندگی باوجود شہرت و مرجعیت اور اس عام مقبولیت کے جو اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں اور دین کے بے لوث خادموں کو عطا فرمایا کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ ان کے تلامذہ اور معتقدین کا حلقہ نہایت وسیع تھا اپنی بعض خصوصیات اور روحانی کمالات کے اعتبار سے ایک طرح سے اخفا اور گمنامی کی زندگی تھی اور ساری عمر ان کمالات پر پردہ پڑا رہا اور بہت سے قریبی عزیزوں اور روزانہ کے اُٹھنے بیٹھنے والوں کو بھی ان کی خبر نہیں ہوئی۔ عام طور پر لوگ ان کو ایک واعظ و خطیب اور مفسر قرآن کی حیثیت سے جانتے تھے۔ لیکن ان کے اصلی کمالات اور ان کی زندگی کے ان گوشوں کے جاننے والے بہت کم ہیں جن کی وجہ سے وہ سلف صالحین اور علماء ربانیین کی آخری یادگاروں میں نظر آتے تھے اور جن سے زہد و ورع، اخلاص و للہیت، ایثار و قربانی، استقامت و ثابت قدمی اور حق گوئی و بے باکی کی ان روایات کی تصدیق اور ان میں ایک وسیع اضافہ ہوتا تھا جو علماء و مشائخ کے قدیم تذکروں میں منقول ہیں۔

راقم سطور کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سنہ سے نیاز حاصل تھا اس کو دلانا ہے علمی

تلمذ اور باطنی تعلیم دونوں کا شرف حاصل تھا، مجھے مولانا کی خدمت میں کئی کئی مہینے کبھی قیام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور خط وکتابت اور ان کی شفقتوں کا سلسلہ تو اخیر تک جاری رہا مدرسہ قاسم العلوم کے زمانہ قیام، فضلاء مدارس عربیہ کے درس قرآن کے حلقہ میں شرکت اور بار بار کی حاضری اور مولانا کے معتمد اور عزیزوں کے ساتھ تعلقات کے ذریعہ مجھے مولانا کی سیرت کے بعض ایسے پہلو اور ان کی بعض ایسی خصوصیات کا علم ہوا جن کا عام طور پر علم نہیں، ان واقعات اور خصوصیات کا تذکرہ قارئین کے لیے بہت سی حیثیتوں سے مفید ہے اور وہ ان کے اندر ایک نئی ایمانی تازگی اور دینی اعتماد پیدا ہونے کا باعث ہو سکتا ہے، یہاں صرف وہی واقعات اور خصوصیات لکھی جائیں گی جن کا مجھے ذاتی طور پر علم ہوا یا مولانا سے قریب تعلق رکھنے والے کسی ثقہ راوی سے سننے میں آئی ہیں۔

زہد و ورع

مولانا کا سب سے زیادہ روشن امتیازی وصف جس میں ان کی نظیر اس نسل میں مشکل سے ملے گی، وہ ان کا تورع احتیاط اور زاہدانہ و مجاہدانہ زندگی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ انجمن خدام الدین کے بانی تھے اور آخر وقت تک اس کے امیر اور صدر انجمن رہے، اس انجمن کی ایک مجلس انتظامیہ تھی جس کے ارکان مولانا پر نہ صرف کامل اعتماد بلکہ ان کی ذات کے ساتھ والہانہ تعلق اور اعتقاد تھا۔ یہ انجمن ایک مدرسہ قاسم العلوم اور ایک مدرسۃ البنات چلاتی تھی۔ اس نے کثیر التعداد تبلیغی رسائل شائع کیے جو لاکھوں کی تعداد میں تقسیم و شائع ہوئے، مولانا کا ترجمہ اور حواشی قرآن بھی مقبول ہوئے، رسالہ خدام الدین اس کا ترجمان اور آرگن ہے، غرض اس کا سارا سرمایہ، اس کا مکتبہ اور اس کی دینی سرگرمیاں سب مولانا کی محنت، اخلاص اور مقبولیت کی رہین منت ہیں، لیکن یہ سن کر بہت سے لوگوں کو حیرت ہوگی کہ مولانا اس سے ایک پیسہ لینے کے کبھی روادار نہیں ہوئے، ساری عمر انھوں نے اعزازی اور رضاکارانہ طریقہ پر خدمت کی، اور اپنی اور اپنی اولاد کے لیے کوئی منفعت حاصل نہیں کی، مجھے ان کے ایک قدیم معتمد خاص نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا سخت علیل ہوئے، معالجین نے آپ کے لیے دوا و غذا کا ایک نظام بنایا جس کی (آپ کی زاہدانہ زندگی میں) گنجائش نہ تھی، انجمن کے ارکان نے یہ سمجھ کر کہ انجمن اور اس کا سارا کام مولانا کے دم سے ہے، ان کی زندگی ہی سے

انجمن کی زندگی اور بقا ہے۔ مولانا کے علاج اور صحت پر کچھ انجمن کے حساب سے خرچ کر دیا، مولانا کو بیماری سے افاقہ کے بعد جب اس کا علم ہوا تو نہایت ناراض ہوئے۔ اور فرمایا کہ تم نے مجھے ناجائز کھلایا اور اس کو اپنے پاس سے ادا کیا۔

جب ہم لوگ مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھتے تھے تو بعض اوقات ملازمین اور واقفین حال سے معلوم ہوتا کہ مولانا کے یہاں کسی کسی وقت فاقہ ہو جاتا ہے بعض اوقات ہم طلبہ کے لیے بڑی فراوانی کے ساتھ کھانے پکتے اور ہم خوب آسودہ ہو کر کھاتے لیکن یہ مجال نہ تھی کہ مولانا کے یہاں اس میں سے ایک دانہ بھی پہونچ جاتا اور ان کے گھر کا کوئی بچہ اس کھانے سے مستفید ہوتا۔ جو ان کی معنوی اولاد شکم سیر ہو کر کھاتی۔ حالانکہ مولانا کا دولت خانہ مدرسہ کے بالکل قریب ہی تھا اور درمیان میں صرف ایک پتلی سی گلی تھی۔

ہم لوگوں کو خوب اندازہ تھا کہ مولانا کے یہاں عسرت اور نہایت سادگی کے ساتھ گذران ہوتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ اخفاء حال اور تکلیف سے بچانے کے لیے مولانا اپنے عزیز مہمانوں کے کھانے کا انتظام باہر کرتے اور انجمن کے کسی خادم یا مسجد کے کسی منتظم کو کچھ نقد عنایت فرما دیتے جس سے ان مہمانوں کی میزبانی ہوتی رہتی، مجھے ایک مرتبہ اچانک اس کا اندازہ اور علم ہوا کہ مولانا کے گھر میں عام طور پر کیسی گذران اور کیا معیار زندگی ہے۔ رمضان مبارک میں غریب مسلمانوں کے یہاں بھی کچھ نہ کچھ اہتمام اور تکلف ہوتا ہے، لیکن مولانا کے یہاں میں نے اتنا بھی اہتمام نہیں پایا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ رمضان مبارک میں مولانا کی خدمت میں مقیم تھا۔ مولانا نے ایک روز فرمایا کہ آج کھانا میرے ساتھ کھائیے گا، افطار ہم لوگوں نے پنجاب کے رواج کے مطابق مسجد میں پانی یا چھوہارے سے کر لیا، نماز مغرب کے بعد مولانا نوافل میں مشغول ہو گئے، فارغ ہوئے تو میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب میں گھر میں اطلاع دینا بھول گیا کہ آج آپ ساتھ کھانا کھائیں گے۔ یہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ فرمایا۔ کھانا آیا تو صرف روٹی اور دال کا پیالہ تھا جو غالباً ایک ہی تھی۔ اسی وقت وہی کا میری خاطر اضافہ کیا گیا۔ مولانا نے کھانا کھاتے بیٹھے فرمایا کہ مولوی ابوالحسن صاحب (مولانا اکثر مجھے اسی طرح یاد فرماتے تھے) ہم سے تو یہ دال اچھی ہے کہ یہ جس مقصد کے لیے پیدا کی گئی تھی اس کو اس نے پورا کر دیا۔ مگر ہم نے اپنی زندگی کی

مقصد پیدا نہیں کیا۔ اس کے بعد بغیر کسی معذرت کے کھانے میں شریک ہو گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ آج کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

مولانا جیسا کہ عرض کیا گیا، انجمن خدام الدین سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے نہ مسجد یا کسی اور ادارہ سے کچھ قبول فرماتے تھے۔ بعض واقفین حال نے یہ بتایا تھا کہ مولانا کبھی کوئی ٹیوشن کرتے ہیں یا ہفتہ کے کسی ایک دن کوئی مزدوری کر لیتے ہیں جس سے بقیہ دن گذران ہو سکے، باوجود قرب کے ہم لوگوں کو اس کا کبھی صحیح علم نہیں ہو سکا۔ اس بارہ میں توکل اور صبر و قناعت کی وہ اسی روش پر قائم تھے جو اہل اللہ کی ہمیشہ سے روش رہی ہے۔

طمع دنیا اور مشتبہ مال سے احتیاط سے زیادہ مشکل غیبت سے اجتناب و احتراز ہے خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو عزلت اور گوشہ گیری کی زندگی نہ گذارتے ہوں ان کا مختلف طبقوں اور کثیر التعداد لوگوں سے واسطہ پڑتا ہو، یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتی جب کسی طبقہ یا فرد سے اعتقادی اور اصولی اختلاف بھی ہو اور اس کے ساتھ صریح ظلم کیا گیا ہو مولانا کو ان نازک موقعوں پر ہمیشہ غیبت اور شکایت سے مجتنب اور محتاط پایا۔ درس میں ہر طرح کا تذکرہ آتا۔ تردید اور تنقید بھی ہوتی لیکن ایک موقع پر بھی مولانا کو اپنے کسی شدید سے شدید مخالف کی بھی غیبت کرتے ہوئے نہیں سنا گیا، احتیاط اور تورع کا ایک حیرت انگیز واقعہ ان کے رفقائے کار سے سننے میں آیا۔ لاہور میں ایک مرتبہ مولانا اور ان کی انجمن خدام الدین کے خلاف لاہور کے چند علماء اور ان کے خدام نے ایک سخت ہنگامہ اٹھایا۔ انجمن نے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو اس وقت ڈابھیل میں تھے اپنے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لیے مدعو کیا تھا، مخالفین نے ان کو انجمن سے بدظن کرنے کی پوری کوشش کی اور بعض لوگوں نے ذاتی تعلقات سے کام لیکر مولانا کی اور انجمن کی شکایات لکھ بھیجیں اور ان کو غلط معلومات مہیا کیں۔ انجمن کے منتظمین نے یہ مناسب سمجھا کہ مولانا احمد علی صاحب خود ڈابھیل چلے جائیں اور اس طویل سفر میں شاہ صاحب کو حقیقت حال سے مطلع کر دیں۔ تاکہ معاندین ان کی تشریف آوری سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔ مولانا تشریف لے گئے اور ساتھ تشریف لائے۔ انجمن کے ذمہ داروں کو اطمینان تھا کہ شاہ صاحب مولانا کے ذریعہ اصل واقعات سے واقف ہو گئے ہیں اور ان کو سب حال بتا دیا گیا ہے۔ لیکن ان حضرات

کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنے مخالفین کے متعلق اس طویل سفر کی فرصت اور طویل رفاقت و صحبت کے باوجود ایک لفظ نہیں کہا۔ اور شاہ صاحب حقیقت حال سے بالکل بے خبر ہیں۔

بے لوث دینی خدمت

مولانا کا شروع سے یہ عقیدہ تھا اور اس کا اظہار اکثر اپنے درس میں فرماتے تھے کہ دین کے خادم اور مبلغ کی تاثیر اور قبولیت کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اپنے سامعین یا حلقۂ تبلیغ سے کسی قسم کا مالی فائدہ نہ اٹھائے اور ان کے کسی احسان، خاطر مدارات اور خدمت ضیافت کا زیر بار احسان نہ ہو۔ مولانا اس اصول پر اس سختی سے کاربند تھے کہ نہ اپنے داعیوں سے کرایہ لیتے تھے نہ ان کی ضیافت قبول فرماتے تھے۔ ہم لوگوں کی تربیت کے لیے بعض مرتبہ فرمایا کہ میں کہیں تبلیغ و وعظ کے لیے جاتا ہوں تو ایک گلاس شربت کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ایک عرصہ تک مولانا کا یہ معمول رہا کہ کرایہ اپنے پاس سے صرف کرتے اور اس کے لیے بعض اوقات آپ کو خاصی مدت انتظار کرنا پڑتا ہو نہ یاس کے اطراف کے ایک سفر کا واقعہ بیان فرماتے تھے (تقسیم ہند سے پہلے) کہ وہاں ایک مخلص دوست نے مجھے بلایا۔ مجھے جتنے دن قیام کرنا تھا اس کے حساب سے میں گھر سے آٹے کی میٹھی ٹکیاں پکوا کر لے گیا تھا۔ چنانچہ پورے زمانہ قیام میں یہی میری خوراک رہی اور مجھے کسی کا مہمان بننے کی یا بازار میں کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

مولانا تبلیغی سفر میں کبھی کسی کا ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ایک سفر میں کسی مخلص دوست نے چند لوگوں کی موجودگی میں مجھے ایک رقم دی مجھے خیال ہوا کہ میں اگر برسر مجلس اس کو واپس کر دیتا ہوں تو ان کی سبکی اور دل شکنی ہوگی میں نے اس کو قبول کر لیا اور لاہور آ کر ان کو کو پن پر یہ لکھ کر رقم واپس کر دی کہ میں نے مصلحتاً یہ رقم اس وقت قبول کر لی تھی اب واپس کر رہا ہوں۔

مولانا ہم طلبہ کو کبھی کبھی اپنے بعض ایسے واقعات سناتے تھے جن سے ہمارے اندر اپنے علمی و دینی منصب کا احترام اور اس کی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان واقعات کا بڑا اثر پڑتا ہے اور سیرت و کردار کی تعمیر میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ایک مرتبہ سنایا کہ حکومت پنجاب کے بڑے عہدے دار اور رئیس نواب ظفر خاں نے اپنے کسی صاحب زادہ یا صاحبزادی

کے نکاح کے لیے مجھے بلایا میں جب مجلس میں داخل ہوا تو بڑے بڑے عمائد شہر اور عہدیداران حکومت موجود تھے انھوں نے مجھے اسی بے پروائی اور استغناء کی نظر سے دیکھا جس نظر سے وہ مولویوں اور نکاح خواں قاضیوں کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ خطبۂ نکاح اور ایجاب و قبول کے بعد نواب صاحب نے ایک معقول رقم جو نوٹوں کی گڈی کی شکل میں تھی مجھے پیش کی میں نے مناسب طریقہ پر اس کے لینے سے معذرت ظاہر کر دی اور ضروری سمجھا کہ اہل مجلس پر بھی یہ بات واضح ہو جائے کہ علماء کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اس کی اجرت قبول کریں، اس سلسلہ میں میں نے ایک مختصر سی تقریر بھی کی اہل مجلس کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ نواب صاحب پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ بڑے احترام کے ساتھ مجھے پہونچانے آئے۔ اور معذرت کی۔

مولانا جب کبھی کسی دینی دعوت پر تشریف لے جاتے تو کوشش کرتے تھے کہ وہ تمام رسوم و تکلفات سے بچے رہیں، جن کو داعی حضرات اور انجمنیں، علماء اور مقررین کے لیے ضروری سمجھتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ آپ کو کسی شہر میں مدعو کیا گیا آپ گاڑی سے اترے استقبال کرنے والے اسٹیشن پر موجود تھے۔ آپ نے منہ پر رومال ڈال لیا اور خاموشی سے کسی ایک طرف سے نکل کر قیام گاہ تک پہونچ گئے۔ استقبال کرنے والے جب مایوس ہو کر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا احمد علی صاحب تشریف لا چکے ہیں۔

درس و اشاعت قرآن کریم مولانا نے تقریباً نصف صدی قرآن مجید کی خدمت و اشاعت اور دینی دعوت و اصلاح کا کام کیا اس بارے میں ایسے انہماک، شغف و محویت، ثبات و استقامت کا ثبوت دیا جو بغیر اعلیٰ درجہ کی عزیمت یقین و للہیت اور روحانی قوت کے مشکل ہے، جب انگریز حکومت نے ان کو دہلی سے جلاوطن کر کے (جہاں وہ مولانا عبید اللہ صاحب کے جانشین کی حیثیت سے قرآن مجید کے مضامین کی اشاعت اور جہاد و حریت کی تلقین کر رہے تھے) لاہور پہونچایا تو آپ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس قرآن کا آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ آپ شیرانوالہ دروازہ میں اس مسجد میں منتقل ہوئے جو لائن والی مسجد یا سبحان خاں کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کا مسقف حصہ نہایت مختصر تھا جو اب بھی موجود ہے۔ رفتہ رفتہ آپ کے درس نے شہر میں عام مقبولیت حاصل کر لی

شروع کی۔ اور پھر تو وہ پنجاب کا سب سے بڑا درس قرآن بن گیا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے آپ ہی کی وجہ سے پنجاب میں درس قرآن کا ذوق عام ہوا اور جگہ جگہ اس کی بنیا دپڑی۔ یہاں تک کہ کسی بڑی مسجد اور پڑھے لکھے مسلمان محلہ کے لیے درس قرآن ایسا ضروری کام ہو گیا جس کے بغیر مسجد آباد اور خطیب کامیاب اور مفید نہیں سمجھا جاتا۔ معمولاً آپ کے درس کے دو اوقات تھے۔ ایک فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد یہ عام درس تھا اور ایک مغرب کے بعد یہ انگریزی داں طبقے اور کالجوں کے طلبہ کے لیے مخصوص تھا۔ اس درس میں صرف جمعہ کے دن ناغہ ہوتا تھا یا جب مولانا سفر میں ہوں اس کے علاوہ چھٹی یا ناغہ کا کوئی دستور نہ تھا۔ بعض اوقات گھر میں میت رکھی ہوئی ہے اور مولانا اپنے درس کا معمول پورا فرما رہے ہیں درس کے بعد حادثہ کی اطلاع دیتے ہیں اور لوگ میت کے جنازہ میں شریک ہوتے ہیں۔

آخر شعبان سے ایک نئے درس کا اضافہ ہوتا تھا "یہ علماء کرام کی کلاس" کہلاتی تھی یہ آخر شعبان سے شروع ہو کر غالباً آخر شوال میں ختم ہوتا تھا۔ یہ درس تین تین چار چار گھنٹے جاری رہتا تھا۔ مولانا کا معمول تھا کہ پہلے امتحان لیتے پھر سبق پڑھاتے۔ اس درس میں صرف مدارس عربیہ کے فارغین اور آخری دوجوں کے مستعد طالب علم لیے جاتے تھے۔ ان کی تعداد معمولاً پچاس دسو کے درمیان ہوتی تھی۔ آخر میں آخری امتحان ہوتا تھا اور پھر کسی صاحب نسبت بزرگ کے ہاتھ سے سندیں دی جاتی تھیں۔ یہ سند مطبوعہ ہوتی تھی۔ اس کا مضمون جو عربی میں تھا حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ اس پر حضرت شاہ صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور غالباً حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے دستخط تھے۔

کبھی کبھی اثناء سال میں حجۃ اللہ البالغہ کا درس ہوتا تھا۔ مولانا کو اس کتاب کا بھی بڑا ذوق تھا اور انھوں نے بڑی محنت سے اس کو اپنے استاد و مربی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے پڑھا تھا۔ اور بڑے جوش اور ولولے سے پڑھاتے تھے۔ یہ درس بھی طویل ہوتا تھا اور کئی کئی گھنٹے مسلسل جاری رہتا تھا۔ آخر میں اس کا بھی لاہور کے کوئی ممتاز عالم امتحان لیتے تھے اور نمبر دیتے تھے۔ راقم سطور کو بھی اس درس میں شرکت کرنے اور امتحان دینے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حجۃ اللہ کے علاوہ شاہ صاحب کی فوز الکبیر اور موطا امام مالک کا درس بھی بڑے ذوق و شوق سے دیتے تھے۔

قرآن مجید کے درس میں مولانا اپنے استاد مولانا عبید اللہ سندھی کے پورے متبع اور پیرو تھے اور ان کو ان کے طرز پر بڑا اعتماد تھا اس طرز کی خصوصیت الاعتبار والتاویل کے طرز پر (جس کی مثالیں صوفیائے کرام کی کتابوں اور ان کے متصوفانہ نکات اور استنباطات میں بہت نمایاں نظر آتی ہیں) سیاست اور واقعات حاضرہ کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید پر غور و فکر کرنا اور اس سے سیاسی اشارات اور رہنمائی حاصل کرنا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرز میں صاف وہ اثرات جھلکتے ہیں جو تحریک خلافت کے دور کی انگریز دشمنی اور اسلامی حکومت کے قیام اور آزادی کی والہانہ خواہش کا نتیجہ تھے اور ان سے وہ سیاسی استغراق ظاہر ہوتا تھا جو اس عہد کی خصوصیت ہے۔ ان استنباطات کی علمی و تفسیری قدر و قیمت کے متعلق خواہ کوئی کتنا ہی شبہ کرے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا احمد علی صاحب کی گہری روحانیت، باطنی تاثیر اور ان کا جذبہ اس پر ایسا حاوی تھا کہ وہ درس روحانی و اخلاقی طور پر طلبہ کے لیے بڑے بڑے علمی درسوں سے کہیں زیادہ مفید اور مؤثر ثابت ہوتا تھا۔ خاص طور پر مولانا جب توحید خالص کا مضمون بیان کرتے (جس کی تقریب مولانا اپنے دعوتی جذبے کی بناء پر اکثر پیدا فرما لیا کرتے اور قرآن مجید کے مضامین اس کی مدد کرتے) اہل اللہ خصوصاً اپنے سلسلہ کے مشائخ کے تعلق باللہ، توکل اور روحانیت کے واقعات بیان کرتے یا الحب للہ و البغض للہ کا مضمون بیان فرماتے اور اس سلسلہ میں اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کی تفسیر بیان فرماتے اور حکومت برطانیہ کی اسلام دشمنی کا تذکرہ کرتے تو قلب پر عجیب اثر ہوتا اور یہی اس درس کی اصل قدر و قیمت تھی۔ اہل اللہ کے واقعات میں ایسا سوز و گداز ہوتا کہ اس سلسلہ کے مضامین بجلی کا اثر رکھتے تھے اور ان سے ذکر الٰہی و خدا طلبی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ راقم سطور کو جو اس سے پہلے ایک خالص ادبی و علمی ماحول میں رہا تھا مردان خدا کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے تعلق پیدا کرنے اور اپنے نفس کی اصلاح کا شوق اسی درس سے پیدا ہوا اور یہ اس درس کا احسان عظیم ہے۔ بعد میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ترجمہ و تفسیر قرآن کے اسباق سپرد ہوئے تو اس درس سے مجھے مدد ملی۔

تبلیغی و اصلاحی خدمات

مولانا سے اللہ تعالیٰ نے جو سب سے بڑا کام لیا وہ عقائد و رسوم کی اصلاح اور توحید و سنت کی اشاعت ہے وہ

حضرات دیوبند کے مسلک پر پورے طور پر عامل اور اس کے پُرجوش مبلغ اور داعی تھے۔ توحید میں ان کا ذوق اور رجحان حضرت مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کی جماعت سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا اور اسی وجہ سے حضرت مولانا حسین علی صاحب (واں بھچراں) سے بہت اچھے تعلقات تھے اور وہ بھی بہت محبت فرماتے تھے اور انجمن خدام الدین کے جلسوں میں آیا کرتے تھے۔ راقم سطور کے محدود علم میں پنجاب اور سندھ میں جتنا مولانا کے مواعظ اور ان کے تبلیغی رسائل اور درس قرآن اور پھر بیعت و ارشاد کے تعلق سے دینی نفع ہو چکا کم لوگوں سے اتنا نفع ہو چکا ہوگا۔ توحید و سنت کی صاف و بے لاگ دعوت کے ساتھ ان میں تصوف کی چاشنی سیاست اور حالات حاضرہ کی بصیرت، اخلاق کی وسعت اور عوام و خواص سے مناسبت بھی جمع تھی جس نے ان کے حلقہ اصلاح کو بہت وسیع اور متنوع بنا دیا تھا۔

افادہ و اصلاح کا ایک بڑا موثر ذریعہ اُن کے جمعہ کے خطبات تھے۔ میرے علم میں لاہور کی کسی مسجد میں اتنا کثیر مجمع اتنے ذوق و شوق کے ساتھ خطبہ سننے نہیں آتا تھا۔ مولانا عربی کے خطبہ جمعہ سے پہلے پورے ایک گھنٹہ تقریر کرتے تھے۔ تقریر زندگی اور واقعات سے قریبی تعلق رکھتی تھی اس میں معاشرہ کی خرابیوں اور لوگوں کے اخلاقی و دینی بیماریوں کی نشان دہی ہوتی تھی اور غلط رجحانات حکومت وقت کی بے دینی اور اس کے انحراف پر اتنی صاف اور کھلی ہوئی تنقید ہوتی تھی جس کی نظیر اس زمانہ میں مشکل ہے۔ بولنے والے کا اخلاص، اس کی بے غرضی، اعتماد علی اللہ، نتائج و عواقب سے بے نیازی اور دین کے لیے دل سوزی اور دردمندی، لوگوں کو مسحور کر لیتی تھی، بہت سی آنکھیں اشکبار نظر آتی تھیں اور بہت سے سر ندامت سے جھکے ہوئے۔ انگریزوں کے عہد اور قیام پاکستان کے زمانہ میں مولانا کی یہ حق گوئی اور بے باکی یکساں طور پر قائم رہی اس میں نہ حکومت کی تمیز تھی نہ جمہور کی۔ اہل شہر کی اخلاقی پستی، تعیش کے رجحان اور اسلامی قانون کی مخالفت کو بڑی بے باکی اور صفائی سے بیان فرماتے تھے، بداخلاقی اور فسق و فجور کے مرکزوں کو شمار کر کے بتاتے اور مسلمانوں کو غیرت دلاتے۔ اکثر خطبہ میں فرماتے۔ اے اٹھارہ لاکھ لاہوریو! میں تم میں چالیس برس سے دبتا ہوں اللہ قرآن سناتا ہوں لیکن شیطان کی صورت کو ترستا ہوں تم سب کچھ ہو

لیکن انسان نہیں ہو، مولانا کی تقریریں سن کر اکثر اقبال کا یہ شعر یاد آتا:

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اسی حق گوئی کی پاداش میں مولانا انگریزوں کے عہد میں بھی کئی مرتبہ جیل گئے اور پاکستان بننے کے بعد بھی (تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں) جیل تشریف لے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت دار و رسن کے لیے تیار بیٹھے ہیں، آخر دور میں علماء کی تنظیم فرمائی اور پاکستان کے مختلف مقامات پر تقریر کر کے حکومت پاکستان کی دینی مداخلت کی پوری قوت کے ساتھ تردید فرمائی۔

اپنے اساتذہ اور مشائخ سے تعلق

جن خوش نصیبوں کو مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے اور درس و مجالس ذکر میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، وہ واقف ہیں کہ مولانا کو اپنے علمی و روحانی مربیوں اور محسنوں سے کتنا گہرا اور والہانہ تعلق تھا۔ یہ ان کی فطری سعادت و وفاداری اور شرافت نفس کی دلیل تھی۔ اپنے استاذ اور مربی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے اپنی وفاداری کا حق ادا کر دیا اور ان کے طریقہ درس کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ غیر منقسم ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچا دیا، مولانا عبید اللہ صاحب کے ہندوستان آنے کے موقع پر جب کہ وہ شیخ وقت اور مرجع خلائق بن گئے تھے ایک ادنیٰ طالب علم اور خادم کی طرح اپنی سعادت مندی کا اظہار کیا۔ اگرچہ ایک موقع پر انھوں نے اپنے استاد سے اختلاف کیا اور جمعیۃ العلماء کے مسلک پر قائم رہے، لیکن یہ ایک اصولی اختلاف تھا جس کا ان کے ذاتی تعلق اور نیاز مندی پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ اور آخر تک ان کے ادب و احترام اور تذکرہ و اشتغال میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مولانا سندھ کے مشہور قادری راشدی سلسلہ میں مجاز تھے اور ان کو اسی سلسلہ کے دو مشائخ کبار حضرت سید تاج الدین محمود امروٹی اور حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوری سے خلافت حاصل تھی، مولانا کا مشکل سے کوئی دن ایسا گذرتا ہو گا جس میں ان دونوں حضرات کے

تذکرہ سے خالی جاتی تھی۔ تذکرہ بھی ایسے والہانہ اور عاشقانہ انداز میں جس سے ان کی قلبی کیفیت اور گہری عقیدت صاف جھلکتی تھی وہ اپنے کو بالکل ان کا پروردۂ نعمت اور ساختہ پرداختہ سمجھتے تھے اور ان کا ہر بن مو ان کے تشکر اور تعریف سے رطب اللسان تھا۔ برسوں گذر جانے اور ہزاروں بار تذکرہ کرنے کے باوجود اس میں وہی تازگی اور چاشنی تھی اور مولانا کبھی اس تذکرہ سے سیر نہ ہوتے تھے گویا مولانا کا عمل اس شعر پر تھا۔

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ
هو المسك ما کررته یتضوع

ادب و تواضع مولانا جہاں اہل دنیا اور اہل دول کے سامنے بڑے خوددار اور غیور واقع ہوئے تھے اہل دین اور خصوصیت کے ساتھ ان حضرات کے سامنے جن کو اپنے مشائخ اور اکابر کی صف میں شمار کرتے تھے حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے علماء حق سے نہایت جھک کر اور فروتنی کے ساتھ ملتے تھے اور ان کی نہایت تعظیم کرتے تھے دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا ان کو اپنے اساتذہ کی صف میں سمجھتے ہیں اور اپنے کو ان کے سامنے ایک طالب علم سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

معاصر علماء و مشائخ میں سے ان کو دو شخصیتوں سے بے حد عقیدت تھی اور وہ ان کے ساتھ اپنے مشائخ کا معاملہ کرتے تھے ایک حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک ہمارے حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہ۔ دیکھنے والوں نے بارہا دیکھا ہے کہ مولانا، حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ دوزانو اس طرح مراقب ہو کر بیٹھ گئے ہیں جیسے کوئی مرید رشید اپنے شیخ کے سامنے۔ اگر حضرت نے کوئی بات پوچھی تو نہایت ادب کے ساتھ مختصر اور بقدر ضرورت جواب دیا پھر خاموش ہو گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ ابتداءً کوئی سوال کیا ہو یا کسی گفتگو میں حصہ لیا ہو۔

مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بڑے معتقد اور ادب شناس تھے جب تک شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ زندہ رہے ان کی خدمت میں مخلصانہ حاضری دیتے رہے اور اپنا بڑا سمجھتے رہے۔ لاہور میں جن علماء سے کچھ استفادہ کیا تھا یا جن کو عالم یا اہل حق میں

سمجھتے تھے ان سے بھی خوردی اور نیاز مندی سے ملتے تھے۔

مشغولیت و مقبولیت مولانا کی زندگی حد درجہ مشغولیت و انہماک اور مجاہدہ و محنت کی زندگی تھی درس کے علاوہ ملاقاتیں، مسائل شرعیہ کا جواب، تلقین ذکر لوگوں کے حالات کا استفسار اور ہمدردی، غرض مشاغل کا ایک سلسلہ تھا جو برابر جاری رہتا بعض وقت ملاقات کے شائقین کو جو دور دور سے آتے تھے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا اور دیر دیر میں باری آتی، میں نے سنا ہے کہ آخر میں نہایت سربرآوردہ اور صاحب وجاہت اشخاص کو کئی کئی دن کے انتظار کے بعد ملنے کا موقع ملتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے مقبول بندوں کے ساتھ معاملہ ہے آخر میں مقبولیت اور رجوع خلائق بہت بڑھ گیا تھا اور مولانا کو زائرین اور معتقدین کے ہجوم اور ان کی کاربراری سے کھانے اور سونے کی فرصت ملنی مشکل ہو جاتی تھی۔ اور نظام اوقات درہم برہم ہو جاتا تھا بعض دن ناشتہ کی نوبت نہ آتی اور بعض وقت کھانا وقت سے بے وقت ہو جاتا۔ جنازہ میں لوگوں کا پروانہ وار ہجوم اور اجتماع عظیم تو وہ منظر تھا جو لاہور کے عظیم شہر نے مدت دراز سے نہیں دیکھا تھا اور شاید مدت دراز تک نہ دیکھے۔ وہ جب لاہور آئے یا لائے گئے تھے تو تنہا تھے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس قرآن کا آغاز کیا تھا لیکن جب اس شہر کو داغ مفارقت دیا تو اللہ کے بندوں کا اتنا بڑا مجمع تھا جس کا شمار آسان نہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا
فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ٥

بقیہ صـــ ۱۳۳

ہمدردی کے مستحق ہیں جن کی وہ اعانت اور سرپرستی فرماتے تھے۔

اس ناچیز کے لیے یہ حادثہ گویا ذاتی ہے۔ ناظرین کرام سے خصوصیت کے ساتھ استدعا ہے کہ مولانا مرحوم کے لیے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی اور ان کے تمام متعلقین اور پسماندگان کے لیے صبر و اجر کی اور ان کے خیر کے سارے کاموں کے لیے جاری اور باقی رہنے کی اہتمام سے دعا فرمائیں۔ جدہ ۲۷ر اپریل ۱۹۶۳ء

محمد منظور نعمانی

مولانا محمد ابن موسیٰ میاں سورتی افریقی ؒ

(ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

الحاج مولانا محمد میاں بن موسیٰ میاں سورتی (مقیم جوہانسبرگ ٹرانسوال جنوبی افریقہ) کا نام نامی مجلس علمی (ساؤتھ افریقہ و کراچی) کے بانی اور سرپرست کی حیثیت سے "مسند حمیدی" کے تعارف کے سلسلہ میں الفرقان کے گذشتہ ہی شمارہ میں ناظرین کرام نے پڑھا ہوگا اس سے پہلے بھی دین اور علم دین کی بعض اہم خدمتوں کے سلسلے میں الفرقان کے صفحات میں ان کا نام بارہا آیا ہے۔

۲۳ر اپریل کو جب کہ راقم سطور حجاز مقدس کے ارادہ سے بمبئی روانہ ہونے کے لیے تیار تھا بالکل اچانک مولانا محمد سعید صاحب (مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت) کا خط ملا جس میں بہت مختصر الفاظ میں یہ انتہائی غمناک اطلاع درج تھی کہ ۱۶ر اپریل منگل کے دن حضرت مولانا محمد بن موسیٰ میاں کا جوہانسبرگ میں انتقال ہوگیا۔ چونکہ اس سے پہلے علالت وغیرہ کی کوئی اطلاع نہیں تھی اور مولانا محمد سعید صاحب کے خط میں بہت ہی مختصر لفظوں میں انتقال کی اطلاع دی گئی تھی اس لیے دل اگرچہ قدرتی طور پر متاثر ضرور ہوا لیکن خبر کے بارہ میں پوری طرح اطمینان نہیں ہوا۔ ۲۳ر اپریل کو لکھنؤ سے روانہ ہوکر ۲۵ر کو بمبئی پہنچنے کے بعد بعض ایسے حضرات سے دریافت کیا جن کے متعلق اندازہ تھا کہ اگر یہ سانحہ واقع ہوچکا ہے تو ان کو ضرور اطلاع ہوگی مگر اس وقت تک ان کو بھی خبر نہیں تھی لیکن اگلے دن ۲۶ر اپریل کو ایک صاحب سے اور اس کے بعد اخبار منادی سورت سے اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ جو لوگ مولانا مرحوم کو جانتے ہیں ان کے نزدیک اس سال کا یہ بڑا سانحہ ہے۔

اللھم اغفر لہ وارفع درجتہ فی المھدیین واخلفہ فی عقبہ فی الغابرین

واغفر لنا ولہ یارب العالمین وافسح فی قبرہ ونور لہ فیہ۔

آج بمبئی سے روانہ ہو کر میں جدہ پہونچ گیا ہوں اور یہ سطریں لکھ رہا ہوں "کل نفس ذائقۃ الموت" کے اٹل قانون کے مطابق ہر زندہ ہستی کی آخری منزل موت ہی ہے انبیا علیہم السلام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں اس حیثیت سے کسی کی بھی موت غیر معمولی اور غیر متوقع حادثہ نہیں ہونی چاہیے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں سے خیر اور نفع کے اہم اور وسیع سلسلے جاری کراتا ہے ان کی موت قدرتی طور پر غیر معمولی محسوس کی جاتی ہے۔ مولانا محمد بن موسیٰ میاں بھی ان ہی بندوں میں سے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں خیر و نفع کی بہت سی وہ چیزیں جمع فرمادی تھیں جو شاذ و نادر ہی کہیں جمع ہوتی ہیں۔

اولاً وہ ایک وسیع النظر اور جید عالم تھے، استاذنا استاذ العلماء حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے سعید ترین اور رشید ترین تلامذہ میں تھے، جس زمانہ میں ناچیز راقم سطور دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا وہ بھی اسی زمانہ میں دارالعلوم کے طالب علم تھے، دورۂ حدیث انھوں نے ناچیز سے ایک سال پہلے پڑھا، طالب علمی اور نوجوانی کے اس زمانہ میں بھی صلاح و تقویٰ ان کا شعار تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی اس رفاقت کے بعد پھر کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن دوسرے ذرائع سے حالات معلوم ہوتے رہے اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی کچھ قائم رہا جو اِدھر ۱۰-۱۵ سال سے بہت بڑھ گیا تھا۔

علم و فضل اور صلاح و تقویٰ کی عظیم نعمتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دولت دنیا بھی بھرپور عطا کی تھی اور دین و علم دین کی راہ میں اللہ کی توفیق سے اس کو بھرپور ہی خرچ بھی کرتے تھے۔ ناچیز کا اندازہ ہے کہ ان کے مصارف خیر کی مقدار ہزاروں سے گزر کر لاکھوں تک پہونچتی ہوگی۔ پھر ان مصارف کی انواع بہت مختلف تھیں۔ مجلس علمی کے تو گویا وہی بانی اور روح رواں تھے، اور انھیں کا سرمایہ اس کا اصل سرمایہ تھا۔ مجلس علمی کے کاموں کا ذکر کبھی کبھی الفرقان میں آتا رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور استاذنا حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی نہایت نفع مند تصانیف کے علاوہ امام زیلعی کی نصب الرایہ اور مسند حمیدی جو ہمارے ہاتھوں میں آچکی ہیں اور مصنف عبدالرزاق پر اس کی طرف سے جو کام ہو رہا ہے صرف یہی کام پچھے خاصے خزانے

کو چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے بعد بھی مجلس علمی کے ان کاموں کا سلسلہ جاری اور ان کے صاحب زادوں کو جو بفضلہٖ تعالیٰ ان کے علم اور دین کے بھی وارث ہیں اس خیر کو جاری رکھنے کی توفیق دے۔

ضلع سورت اور اس کے اطراف میں دینی تعلیم کے مکاتب کا ایک وسیع نظام "انجمن خدام الدین" کے عنوان سے جاری ہے اس کے بانی اور روح رواں بھی مولانا محمد بن موسیٰ میاں ہی تھے، یہ نظام اس قدر باقاعدہ اور مستحکم ہے کہ مختلف صوبوں اور علاقوں میں چلنے والی دینی تعلیم کی تحریکوں کو اس کے طریق کار اور دفتری نظام سے استفادہ کرنا چاہیے اس تعلیمی نظام پر بھی غالباً وہ ہزاروں ماہوار خرچ کرتے تھے اس کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان سیکڑوں دینی مدارس اور دینی اداروں کی مستقل امداد فرماتے تھے جن کے متعلق اطمینان تھا کہ ان کا نظام اور کام قابل اعتماد ہاتھوں میں ہے، اسی طرح مفید دینی تحریکوں کی بھی وسیع پیمانہ پر امداد فرماتے تھے۔

اس سب کے علاوہ جن جن حضرات کے متعلق ان کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ دین یا علم وغیرہ کی فلاں خدمت کر رہے ہیں، ان کو بڑے اکرام کے ساتھ مسلسل ہدیے بھیجتے تھے اور اپنے بے تکلف دوستوں سے اس بارہ میں برابر معلومات حاصل کرتے رہتے تھے کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ان کے دریافت کرنے پر بعض حضرات کے بارے میں راقم سطور نے ان کو لکھا کہ وہ دین کی فلاں خدمت میں مشغول ہیں اور ان کے یہ حالات ہیں تو انھوں نے اس اطلاع پر دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کیا اور بہت ممنونیت کا اظہار فرمایا۔

اس ناچیز پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل رہا ہے کہ جن اکابر علما یا صلحا کا زمانہ پایا اکثر و بیشتر ان کی زیارت بھی نصیب ہوئی لیکن ایسا بندہ ایک ہی دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری چیزیں جمع فرما دی تھیں اور اس کی ذات سے خیر کے اتنے سلسلے جاری تھے۔

اپنے استاذ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری سے ان کو عشق تھا اور اس دور کے اکابر میں سے خاص عقیدت اور مناسبت حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ سے تھی۔

ان کا انتقال ہمارے دینی حلقے اور اس دور کے دینی کاموں کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے اور ان کے گھر والوں کے علاوہ وہ سارے دینی ادارے اور دینی کام بھی تعزیت اور

(باقی ص۱۳۱ پر)

چائے
کے تھوک اور خوردہ بیوپاری
برڈی ٹی کمپنی
ہوٹل کی ترقی
اور
خریداروں کی
پسند کی خاطر
ہمیشہ ہماری ارزاں اور بہترین چائے استعمال کیجئے
برڈی ٹی کمپنی
حسینی بلڈنگ دوکان نمبر ۸-۵ ایس۔ وی۔ پٹیل روڈ
نل بازار۔ بمبئی ۳

محمد منظور نعمانی

ایک مردِ مومن کی وفات

(حاجی عبداللہ احمد امراؤتی)

(ربیع الاول ۱۳۷۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

دنیا کے اس کارخانہ میں موت و حیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جو یہاں پیدا ہوا ہے اور جی رہا ہے ایک دن یہاں سے اس کا کوچ کر جانا یقینی ہے، اس لیے کسی کی موت بجائے خود کوئی غیر معمولی حادثہ نہیں، لیکن اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی علاقہ میں اپنی ذات سے خیر اور بھلائی کا ایک ادارہ ہوتے ہیں اور ان کے اس دنیا سے جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ علاقہ خیر کے اس ادارہ اور سلسلہ سے محروم ہو گیا۔

امراؤتی (برار) میں ایک میمن تاجر حاجی عبداللہ احمد صاحب اسی قسم کے ایک مردِ مومن تھے۔ دولت کے لحاظ سے کوئی بہت بڑے سیٹھ نہیں تھے لیکن اخلاقی بلندی اور نیکی اور خدمت کے کاموں میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے پورے علاقہ میں ان کی ساکھ بہت اونچی تھی، بڑے سمجھدار اور بڑے پختہ دیندار تھے اور ان کی دینداری میں بڑا اعتدال اور توازن تھا، دین کی فکر اور مسلمانوں کا درد گویا زندگی کی روح تھی، عمر اب نوّے سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن ضعفِ پیری کے باوجود دینی اور ملی کاموں میں جوانوں کی طرح حصہ لیتے تھے برار میں ہونے والے اکثر دینی و ملی تعلیمی و تبلیغی کاموں کا سلسلہ نسب حاجی صاحب ہی سے ملتا ہے ——— یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے ایک دینی و ملی انجمن اور تعلیمی تبلیغی اور اشاعتی ادارہ تھے ——— ۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء کے شروع میں امراؤتی میں اسی قسم کا ایک فساد برپا کیا گیا جس قسم کے فسادات ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندستان کے بعض مقامات سے

شہروں میں ہوتے رہے ہیں اور جن کا نشانہ مسلمان بنتے رہے ہیں؛ کبھی بازار امراوتی کا بڑا بازار ہے، اس میں مسلمان میمن تاجروں کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں، انھیں میں حاجی صاحب کی بھی ایک دوکان تھی جس کی عمارت بھی انہیں کی ذاتی جائداد تھی، لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا اس میں مال بھی تھا اور وہی ان کا سارا اثاثہ تھا۔ ان دوکانوں کو حسب معمول لوٹا اور جلایا گیا، حاجی صاحب اور ان کے اہل وعیال اس حال میں جان بچا کر کسی طرح نکل سکے کہ جسم پر پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ گھر والوں نے امراوتی چھوڑ کے پاکستان جابسنے کے لیے اصرار کیا جہاں تعلقات اور اثرات کی بنا پر ان کو بہت اچھے مستقبل کی امید ہوسکتی تھی لیکن حاجی صاحب یہاں سے جانے پر صرف اس لیے آمادہ نہیں ہوئے کہ میرے جانے سے یہاں کے مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہوگی اور جن دینی و ملی کاموں سے میرا تعلق ہے خدانخواستہ ان پر اثر پڑے گا ــــــ فساد کی اس تباہی و بربادی کے بعد حاجی صاحب درحقیقت بالکل خالی ہاتھ رہ گئے تھے، لیکن ایمان کی طاقت نے ان کو سہارا دیا اور انھوں نے بالکل نئے سرے سے کسی طرح کاروباری زندگی پھر شروع کی اور بظاہر اسی طرح اور اسی شان کے ساتھ رہے جس طرح اور جس شان سے وہ امراوتی میں پہلے رہتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہ ۱۲-۱۳ سال بڑے ابتلا میں گزرے مگر دینی و ملی فکروں اور کوششوں میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، بلکہ راقم سطور کا اندازہ ہے کہ اضافہ ہی ہوتا رہا ــــــ بعض دینی سفروں میں ان کے ساتھ رہنا ہوا میں نے ان کو راتوں میں اللہ کے حضور میں بلک بلک کے روتا ہوا دیکھا ــــــ اپنی زندگی میں جن چند آدمیوں کو دیکھ کر مجھے ان پر رشک آیا ان میں سے ایک یہ حاجی عبداللہ احمد صاحب بھی تھے ــــــ بیماری اور اس کی شدت وخطرناکی کی اطلاع تو کوئی دو ہفتہ پہلے ہو گئی تھی، اب ۲۲ر جولائی کو ان کے صاحبزادے عبدالقادر سلمہٗ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ یکم ربیع الاول کی صبح کو حاجی صاحب اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت کی طرف منتقل ہو گئے اناللہ وانا الیہ راجعون اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت ومغفرت کا خاص معاملہ فرمائے اور ان کے پسماندگان اور متعلقین کی وہ خاص مدد فرمائے، ان کے دلوں کو وہ صبر اور سہارا دے جس کے وہ اس وقت خاص طور سے محتاج ہیں ــــــ ناظرین کرام سے بھی اسی دعا کی درخواست ہے۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب علیہ الرحمہ

(ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

دین کے احیاء کی وہ تحریک جسے "تبلیغی کام" سے موسوم کیا جاتا ہے جو شخص بھی اس کی جس قدر افادیت کا قائل ہے اسی قدر رنج والم کے ساتھ اس نے یہ خبر سُنی ہو گی کہ اس کام کے سربراہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اچانک وفات پائی۔ اور احیاء دین کی اس جد وجہد کی وہ مثالی شخصیت جس کے جذبۂ و عمل کے مشاہدے اور جس کے انفاس گرم کی تاثیر سے کتنوں ہی کو ہمہ سوز و ہمہ عمل ہو جانے کی توفیق ملی وہ آج راہِ خدا کے ان دیوانوں کے درمیان موجود نہیں ہے۔

بے شک بقا و دوام اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کی اس دنیا میں کسی کو موت سے رستگاری نہیں۔ لیکن یہ بھی حق ہے کہ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا نے جس راہ پر دیوانہ وار چلتے ہوئے جان دی ہے یہ اسی عشق کی راہ ہے جس میں مر کر بھی آدمی مرتا نہیں۔ اُس کی صرف یاد زندہ نہیں رہتی بلکہ اس یاد کے اثرات سے دلوں کو زندگی ملتی ہے اور یہی حیات دوام ہے جو صرف عشاق کے نصیب میں آتی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں دین سے معمولی تعلق رکھنے والا بھی کون مسلمان ہو گا جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام نامی سے آشنا نہ ہو۔ آپ کے عظیم المرتبت والد ماجد حضرت

مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے ۴۰ برس پہلے دین کی عمومی دعوت اور اس کے احیاء کی جو عظیم کر سادہ جد وجہد اپنی مومنانہ بصیرت اور ایک والہانہ سوز و تڑپ کے اثر سے شروع کی تھی، مولانا کے انتقال پر (یعنی اب سے ۲۰ برس قبل) اس کی گراں بار ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر آئیں جبکہ آپ کا سن ۳۰ برس کے اندر تھا۔ مگر آپ کی خداداد صلاحیتوں نے اس بیس برس کے اندر اس دینی تحریک کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ پہلے جس کام کا دائرہ عمل غیر منقسم ہندوستان کے اندر محدود تھا اب اس کی جڑیں روئے زمین کے ہر ہر خطہ میں جا پہونچیں اور خود ہندوستان و پاکستان کے اندر وہ مناظر اس کام کی وسعت و مقبولیت کے آج آئے دن نظر آتے ہیں۔ جو کل حسرت آرزوؤں اور تمناؤں کا درجہ رکھتے تھے ——

غرض وہ پودا جو تھوڑی سی ہی نشو و نما حضرت مولانا محمد الیاسؒ صاحب کی زندگی میں پا سکا تھا مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی مجاہدانہ کوششوں اور وہبی صلاحیتوں سے ایک قد آور درخت کی شکل میں دنیا کے سامنے ہے اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا

افسوس اس ہستی کا چراغ حیات ۲ اپریل (۲۹ ذی قعدہ) یوم جمعہ کی سہ پہر کو لاہور کی سرزمین پر آناً فاناً گل ہو گیا۔ ایک ہستی کا چراغ نہیں بجھا دین کا ایک روشن چراغ بجھ گیا۔ روشنی کا ایک بلند مینار گر گیا۔ دین کے لیے سوز و تڑپ کی ایک تصویر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، جسے دیکھ دیکھ کر ہر دن اور ہر رات نہ معلوم کتنے دلوں میں اسی تڑپ کی بجلیاں کوندنے لگتی تھیں —— خدا اپنی رحمت بے پایاں کی بارشیں ان کی روح پر فرمائے اور اس عظیم خلا کو اپنی قدرت خاص سے پُر فرمائے جو ان کی اچانک وفات سے پیدا ہو گیا ہے ——

مولانا کا لاہور میں قیام اسی دینی دعوت کے سلسلے میں تھا جس کے لیے ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ وقف تھا۔ شوال کے پہلے (اور فروری کے دوسرے) ہفتے میں آپ اپنے رفقاء کے ساتھ پاکستانی احباب کی دعوت پر مشرقی اور مغربی پاکستان کے ایک لمبے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ لاہور اس سفر کی آخری منزل تھی اور ۲ اپریل ۲۹ ذی قعدہ ہی کی تاریخ دہلی واپس ہونے کے لیے مقرر تھی۔

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

— وہ ایسی ٹھیک اسی تاریخ کو ہوئی مگر کس طرح کہ وہ لاہور ہی میں جمعہ وعصر کے مابین ابدی نیند سو چکے تھے اور اسی نیند کے عالم میں شب کو تین بجے ایک ہوائی جہاز انھیں دہلی کے ہوائی اڈہ پر لے کر اترا اور وہ تبلیغی مرکز و مسجد جہاں دوسرے دن صبح کو ان کے ارشادات سننے اور ان کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے لیے دور دور سے سمٹ کر مشتاقوں کا مجمع ہوتا تھا اُن کے اشکبار سوگوار دل سے بھری ہوئی تھی۔ اور مسجد کیا بھری ہوئی تھی دہلی بھری ہوئی تھی۔

افسوس یہ کیسی بجلی ملت کے شکستہ ایوان پر گری اور کیسی نعمت چشم زدن میں ہاتھوں سے نکل گئی۔ ابھی مولانا کی عمر پچاس سال کی بھی نہ تھی۔ قویٰ مضبوط اور جسم تنومند تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ دل سے جتنا کام لیتے تھے اور اعصاب پر جتنی شدید محنت کا بوجھ انھوں نے ڈال رکھا تھا اس میں ظاہری قوت و صحت کے باوجود دل کا جواب دے جانا کوئی بہت حیرت انگیز واقعہ نہیں۔ دن و رات میں کئی کئی بار طویل طویل خطابات، پھر ان خطابات میں ایک جذبہ و حال۔ دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے کام کی فکر و نگہداشت، آرام سے بے نیازی، صحت و مرض کی تفریق سے لاپروائی، ہر لحظہ محویت کا عالم، یہ ایسی چیزیں نہیں جنھیں قلب و اعصاب بڑی مدت تک برداشت کر سکیں۔ بے شک یہ بڑا ہی عظیم خسارہ ہے کہ دین کے احیاء کی جد و جہد کے لحاظ سے ایک نادرۂ روزگار ہستی یوں آن کی آن میں دُنیا سے اُٹھ گئی۔ مگر انھوں نے ایک نمونہ دیا ہے کہ آدمی کر باندھے تو دین کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ایسے زندۂ جاوید نمونے جب اُٹھتے ہیں تو اپنے پیچھے میدان خالی چھوڑ کر نہیں جاتے۔ ان کی موت سے زندگی کے چشمے اُبلتے ہیں، وہ ایک روح ایک کی جگہ کتنوں ہی میں سرایت کرتی ہے اور جو جذبہ ایک ذات میں محدود تھا وہ موت کے بعد کتنوں ہی کی میراث بن جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس حادثہ کا صرف صدمہ ہی ملت کے حصے میں نہیں آئے گا بلکہ اس کا یہ صلہ بھی خدا کی رحمت سے بھرپور عطا ہوگا۔

کچھ تفصیلات ان سطروں کی تحریر کے بعد مولانا کے سانحۂ ارتحال کی کچھ تفصیلات علم میں آئی ہیں جن کا اضافہ مناسب ہوگا۔

معلوم ہوا ہے کہ مولانا کی طبیعت کچھ پہلے سے مضمحل چل رہی تھی۔ چہارشنبہ ۳۱ مارچ کے ایک
پروگرام میں مولانا کی تقریر کے اندر نمایاں طور پر کچھ رکاوٹ اور نقاہت محسوس کی گئی اور اس کے بعد
مولانا کے تمام پروگرام منسوخ کرنا طے کر دیا گیا۔ جمعرات یکم اپریل کو غالباً بعد نماز مغرب ایک عقد
نکاح میں مولانا کو تقریر فرمانا تھی۔ یہ ذمہ داری بھی وقت پر مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری کے سپرد
کر دی گئی اور وہ اس غرض کے لیے تشریف لے گئے۔ لیکن بعض حضرات یہ دیکھ کر کہ بڑا ہی منتخب مجمع
آیا ہوا ہے مولانا کی خدمت میں واپس آئے اور بالآخر مشورے سے مولانا ہی کو زحمت دیدی گئی مولانا
نے تقریر فرمائی جس میں وہی نقاہت ورکاوٹ تھی۔ حد یہ ہے کہ اپنی عادت کے حیرت انگیز حد تک
خلاف صرف ایک منٹ کی دعا فرمائی اور اس طرح تقریب کی تکمیل کر کے فوراً واپس ہو پڑے۔ قیام گاہ
چونکہ بالکل ہی متصل تھی اس لیے سواری کا سوال نہ تھا۔ مگر قیام گاہ پکڑ نہ سکے راستے ہی میں بیہوشی
طاری ہو گئی۔ پسینے سے تر بتر تھے۔ ہاتھوں ہاتھ قیام گاہ پر لائے گئے۔ حکیم ڈاکٹر کی دوڑ ہوئی گھنٹوں
کے بعد ہوش آیا۔ عشا کی نماز ساڑھے تین بجے اشاروں سے پڑھی۔ نماز فجر بھی اشاروں سے ادا ہوئی۔
رفیقوں سے معافی مانگی۔ ہر دم کے رفیق اور عزیز قریب مولانا انعام الحسن صاحب کو اپنی کتابوں کی زکوٰۃ
نکال دینے کی وصیت کی ڈاکٹروں نے صبح کے معائنہ کے بعد کہا اب خطرے سے باہر ہیں مگر شدید احتیاط
کی جائے، دوسرا دورہ ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔ دہلی کو واپسی جو اسی جمعہ کے دن طے تھی اس کا تو اب
سوال ہی کیا رہا تھا مگر قضا و قدر کے نوشتوں میں واپسی کی یہ تاریخ اٹل ہو چکی تھی۔ ٹھیک جس وقت
جمعہ کا خطبہ شروع ہو رہا تھا حالت متغیر ہو گئی۔ قیام گاہ چونکہ بالکل متصل ہی تھی امام نے ہلچل
محسوس کر لی۔ ماشاء اللہ فقیہ تھے اور رفیق بھی بے حد اختصار سے خطبہ اور نماز پوری کی۔ ڈاکٹر
بلائے گئے۔ سانس اکھڑی ہوئی تھی مگر ہوش و حواس قائم تھے۔ مولانا انعام صاحب سے سانس کی
طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بھی سمجھ تو چکے تھے مگر کہا شاید بلغم پھنس رہا ہے۔ فرمایا
نہیں سانس پھنس رہی ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر آ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اب آکسیجن کی منزل ہے۔ فوراً
اسپتال کا مشورہ دیا۔ مولانا نے اسپتال کی بات سُنی تو فرمایا وہاں نرس ہوتی ہیں میں نہ جاؤں گا۔
پاکستان کے باا ثر اشخاص نیازمندوں میں تھے۔ عرض کیا حضرت ایک نرس بھی پاس نہ آ پائے گی۔ آپ
اطمینان فرمائیں۔ فرمایا پھر کوئی مضائقہ نہیں، از راہِ عجلت ایک بڑی کار میں جو وہاں بہت سی

(باقی صفحہ پر)

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی رح

(رجب ۱۳۸۵ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

آج ہی ۳۰ اکتوبر کو عصر و مغرب کے درمیان اس عظیم سانحہ کی خبر ملی کہ شیخ وقت اور جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (مقیم مدینہ طیبہ) کا وصال ہو گیا — انا للہ وانا الیہ راجعون —
اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ واکرم نزلہ والحقہ بسلفہ الصالحین من عبادک الذین رضیت عنھم ورضوا عنک۔

اس دنیا میں کسی آدمی کا پیدا ہونا اور اٹھ جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ روزانہ ہزاروں انسان اس دنیا میں آتے ہیں اور اسی طرح ہزاروں موت کے راستے سے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ بندے جو اپنے احوال و اوصاف، اور فیوض و برکات کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں ان میں سے کسی کا اٹھ جانا بلاشبہ انسانی دنیا کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے جس سے زمین و آسمان بھی متاثر ہوتے ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے۔

یذھب الصالحون الاول فالاول وتبقی حفالۃ کحفالۃ الشعیر او التمر لا یبالیھم اللہ بالۃ۔	اللہ کے نیک بندے ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جائیں گے اور ایسے لوگ رہ جائیں گے جو ان کی نسبت سے ایسے ہوں گے جیسے جَو کی بھوسی یا سوکھی کھجوروں کے چھلکے جن کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

یہ گنہگار راقم السطور اپنے شعور کے گزشتہ قریباً چالیس سالوں میں یہ منظر برابر دیکھتا رہا ہے —

حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہما کی تو صرف زیارت ہی نصیب ہوئی، ان کے بعد حکیم الامت حضرت تھانوی، حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد الیاس اور مرشدنا حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری (قدس اللہ اسرارہم) کا کچھ قرب و تعلق بھی اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمایا۔ ان سب کی وفات پر یہی محسوس ہوا کہ دین اور علم و معرفت کا نور دنیا سے اٹھتا جا رہا ہے اور ظلمت اس کی جگہ لے رہی ہے — ہمارے ان اکابر و مشائخ کی کچھ یادگاریں باقی تھیں اور باقی ہیں، ان میں ایک بڑی صاحب فیض شخصیت حضرت مولانا محمد یوسف رح کی تھی جس کو اللہ تعالیٰ کے فیصلہ نے اسی سال ہم میں سے اٹھالیا اور وہ ہمارے اس سال کا بہت بڑا دینی سانحہ تھا، حضرت مولانا بدر عالم صاحب رح کی وفات بھی ہماری دینی دنیا کا بڑا عظیم سانحہ ہے۔

مولانا موصوف شیخ وقت بھی تھے اور اس دور کے جلیل القدر عالم دین بھی، عصر حاضر کی خصوصیات اور اس کے تقاضوں کو سمجھنا اور علوم نبوت کی تشریح اس طرح کرنا جس سے اس دور کے پیدا شدہ مسائل بھی حل ہوں ان کا خاص امتیاز تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "ترجمان السنۃ" ان کے اس کمال کی آئینہ دار ہے — افسوس کہ اس کی صرف ۳ جلدیں مولانا لکھ سکے جو شائع بھی ہو گئی ہیں۔ (چوتھی جلد حال ہی میں پاکستان میں شائع ہوئی ہے۔)

مولانا مرحوم حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، پہلے دورۂ حدیث مظاہر العلوم میں پڑھ چکے تھے، اس کے بعد صرف حضرت شاہ صاحب سے علمی استفادہ کی غرض سے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیکر دوبارہ دورۂ حدیث یہاں پڑھا، پھر چند سال تک دار العلوم میں مدرس بھی رہے۔ بعد میں جب قضاء و قدر کے ایک فیصلہ نے حضرت شاہ صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ کو جامعہ اسلامیہ (ڈابھیل سورت) بھیجدیا تو مولانا بدر عالم صاحب بھی جامعہ کے ایک استاذ کی حیثیت سے ان حضرات کے ساتھ یہاں آگئے اور یہاں کئی سال تک مسلسل حضرت شاہ صاحب رح کے درس بخاری میں بیٹھ کر حضرت کے درسی افادات قلم بند کرتے رہے جن کو بعد میں عربی میں مرتب کیا اور فیض الباری کے نام سے وہ چار جلدوں میں مصر میں چھپکر شائع ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں مولانا ممدوح ہندوستان سے پاکستان چلے گئے اور ۴ سال کے بعد ۱۹۵۱ء میں وہاں سے حجاز مقدس آگئے اور جنت البقیع میں دفن ہونے کی آرزو کے ساتھ مدینہ طیبہ میں قیام کر لیا۔

کئی سال ہوئے موٹر کے ایک ایکسی ڈنٹ میں ایسے مجروح ہو گئے تھے کہ بچنے کی توقع نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ابھی زندہ رکھنے کا تھا، زندہ رہے لیکن اس کے بعد صرف لیٹے رہ سکتے تھے بیٹھنے کے قابل بھی نہ تھے مگر دینی و علمی افادہ و افاضہ کا سلسلہ الحمدللہ جاری رہا۔ لیٹے لیٹے دینی اور اصلاحی گفتگو ہر وقت فرماتے رہتے تھے۔

عام مسلمانوں کے افکار و خیالات اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لیے "جواہر الحکم" کے نام سے آسان زبان میں احادیث نبویہ کی شرح کا ایک سلسلہ جاری فرما رکھا تھا، اب سے ۲ مہینے پہلے جب یہ عاجز مدینہ طیبہ حاضر ہوا، تو اس کا دوسرا حصہ عنایت فرمایا تھا، آج خبر وفات ملنے پر اس کو اٹھا کر دیکھا تو بسم اللہ اور حمد و صلوٰۃ کے بعد مولانا نے اس میں لکھا تھا:۔

"اس وقت عالم کے انقلابات کا ہولناک نقشہ اور علما و صالحین کا بڑی تیزی سے اٹھتے چلے جانے کا عبرتناک سماں میری آنکھوں کے سامنے ہے اس لیے اس سلسلہ کی چند احادیث اس حصہ میں بے اختیار درج ہو گئی ہیں تاکہ اہل فہم و سعادت اپنی قلیل فرصت کو بے کار ضائع نہ کریں اور جتنی جلد ممکن ہو اعمال خیر میں ہمت سے کام لیں۔"

عجب نہیں کہ مولانا پر اپنی وفات کا قرب منکشف ہوا ہو، اور یہی اُن کے لیے اس سلسلہ کا باعث اور محرک ہوا ہو۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے دینی و علمی فیض کو تا قیامت جاری رکھے اور مسلسل ترقیات اور رفع درجات کا اس کو ذریعہ بنائے اور اپنی رحمت و رضا سے ان کو نوازے اور پسماندگان و متعلقین کو صبر جمیل اور احتساب کی توفیق دے اور ان کی پوری سرپرستی و نگرانی فرمائے۔ ناظرین کرام سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

محمد منظور نعمانی

اللہ کے دو بندے

حضرت مولانا عبد الرحمٰن کاملپوریؒ
و
حضرت مولانا شیر محمد سندھی مہاجر مدنیؒ

(ربیع الاول ۱۳۸۶ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

بلاشبہ زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ آدم کی اولاد اپنی دنیوی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھائے۔ اور خود آدمی کی تخلیق کا خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اور اس ساری کائنات کے خالق و مالک کو پہچانے اور اس کی عبادت و فرمانبرداری کے ذریعہ اس کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرے ــــ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ"

پھر اس مقصد کی طرف دعوت اور راہ راست کی رہنمائی کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا گیا، سارے پیغمبر اسی لیے آئے کہ خدا کو پہچنوائیں، اس کی ذات و صفات کے بارہ میں بندوں کو بتائیں اور اس کی عبادت و فرمانبرداری کی دعوت و تعلیم دیں ــــ جو بندے اپنی تخلیق کے اس خاص مقصد سے غافل ہو کر صرف دنیا کے کیڑے اور نفس کے پجاری بن جائیں ان کی قدر و قیمت ان کے خالق و مالک کی نگاہ میں مکھی و مچھر سے کچھ بھی زیادہ نہیں رہتی اور ایسے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے ختم ہو جانے سے بھی اس دنیا کی قدر و قیمت اور معنویت میں کوئی کمی نہیں آتی، اور زمین و آسمان جو اس پوری دنیا کے لیے گویا ماں باپ کی طرح ہیں، کوئی رنج و صدمہ محسوس نہیں کرتے، ایسے ہی بعض انسانی گروہوں کی ہلاکت

و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ" (نہ تو ان پر زمین روئی اور نہ آسمان نے کوئی آنسو گرایا)

اس کے برعکس جو بندے اپنی تخلیق اور زندگی کے اس مقصد کو یاد رکھیں اور اللہ کے قرب و رضا کو اپنا نصب العین بنا کر اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزاریں وہ اپنے خالق و مالک کی نگاہوں میں عزیز و محبوب ہوتے ہیں، انھیں کو عرف خاص میں "اولیاء اللہ" اور "خلفاء انبیا" کہا جاتا ہے، دور نبوت ختم ہونے کے بعد انھیں کے ذریعہ سے انبیاء علیہم السلام کے فیوض و برکات اس دنیا کو ملتے ہیں، وہ جب دنیا سے اٹھائے جاتے ہیں تو زمین و آسمان اور اللہ کے معصوم فرشتے احساس و تاثر اور رنج و غم میں ان کے متعلقین اور محبین کے شریک ہوتے ہیں، ان کی وفات خود ان کے حق میں محبوب حقیقی کا وصال اور ایک طرح کی معراج ہوتی ہے، لیکن ہماری اس دنیا کا ان کے انفاس کی برکات سے خالی ہو جانا دنیا کی روح کے لیے بڑا غمناک حادثہ ہوتا ہے۔

پچھلے چند مہینوں میں ایسی ہی دو بابرکت ہستیوں سے ہماری دنیا خالی ہو گئی۔ ایک حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری قدس سرہٗ دوسرے حضرت مولانا شیر محمد صاحب سندھی ثم المدنی۔ مہاجر نور اللہ مرقدہٗ۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ

ہندوستان اور پاکستان کے اہل علم میں سے شاید کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو حضرت مولانا سے واقف نہ ہو۔ مدت دراز تک ہندوستان کی عظیم دینی درسگاہ مظاہر علوم سہارنپور کے صدر مدرس رہے سلوک کی منزلیں اسی زمانہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی رہنمائی میں طے کیں اور اس طرح کہ اس سلسلہ کی ان کی پوری خط و کتابت اس راہ کے سالکین کے لیے مشعل راہ قرار دے کر "اشرف السوانح" کا جز بنا دی گئی۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے مولانا مرحوم کو صرف خلافت ہی سے سرفراز نہیں فرمایا بلکہ بیعت ہونے والے اکثر علماء و فضلاء کو حضرت قدس سرہ تربیت کے لیے حضرت کاملپوریؒ ہی کے سپرد فرماتے تھے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے وطن کاملپور ہی میں تھے، ملک کی تقسیم

جن حالات میں اور جس طرح ہوئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے اس کا امکان ہی ختم کر دیا کہ حضرت ممدوح پھر سہارنپور تشریف لائیں۔ اور بلاشبہ اس میں بھی خیر کا یہ پہلو مضمر تھا کہ خطۂ پاکستان کو خاص ضرورت تھی کہ ایسی بابرکت ہستیاں وہاں رہیں ـــــ حضرت مولانا شروع میں کئی سال تک "دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار" (حیدرآباد سندھ) میں صدر مدرس رہے؛ اس کے بعد اپنے وطن ہی میں قیام فرما لیا اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جو امانت اور خدمت آپ کے سپرد کی تھی اس کو انجام دیتے رہے۔

گزشتہ شعبان کے آخری ہفتہ میں اس وقت وصال فرمایا جب ہندستان و پاکستان کے درمیان ڈاک کی آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ اس لیے اس وقت تو یہاں کسی کو علم ہی نہ ہو سکا۔ رمضان مبارک کے آخری ہفتہ میں جب یہ عاجز شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہٗ کی خدمت میں سہارنپور حاضر ہوا تو حضرت نے ذکر فرمایا۔ ان کو غالباً حجاز مقدس کے کسی خط سے چند ہی روز پہلے اس کی اطلاع ہوئی تھی ـــ پھر جب معاہدۂ تاشقند کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کا سلسلہ جاری ہوا تو ماہنامہ "بینات" کراچی سے اور اس کے بعد گزشتہ مہینہ مئی کے شروع میں حضرت مولانا مرحوم کے صاحبزادہ مولانا سعید الرحمٰن صاحب کے گرامی نامہ سے کچھ تفصیل معلوم ہوئی۔

اہل اللہ کے الوان مختلف ہوتے ہیں کسی پر کسی رنگ کا غلبہ ہوتا ہے کسی پر کسی صفت کا۔ اس عاجز کو حضرت مولانا مرحوم کی چند دفعہ صرف زیارت ہی نصیب ہوئی ہے۔ اپنا احساس اور تاثر یہ ہے کہ حضرت ممدوح اپنی صورت و سیرت کے لحاظ سے ان خاصان خدا میں سے تھے جو غلبۂ ملکیت کی وجہ سے ملائکہ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ حضرت کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کانّ الملک نزل من السماء[1] ـ واللہ اعلم باحوال عبادہ

حضرت مولانا شیر محمد مہاجر مدنیؒ

اب سے ۲۴ سال پہلے جب الفرقان بریلی سے جاری ہوا تو کچھ دنوں تک یہ عاجز خود ہی اس کا اڈیٹر تھا اور خود ہی اس کا محرر۔ اس ابتدائی دور میں گھوٹکی ضلع سکھر (سندھ) سے الفرقان جاری کرانے کے لیے سالانہ چندہ کا ایک منی آرڈر آیا۔ مرسل کا نام صرف "شیر محمد" لکھا ہوا تھا۔

---

[1] گویا آسمان سے فرشتہ اتر آیا ہے۔

اور تحریر کی سادگی سے اس کا شبہ بھی نہیں ہوا کہ یہ کوئی صاحب علم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ خریداروں کے رجسٹر میں میں نے ان کا نام صرف "شیر محمد صاحب" لکھ دیا۔ عرصہ کے بعد الفرقان کے ایک مضمون کے بارہ میں (جو غالباً مسئلہ سماع اموات سے متعلق تھا) ان صاحب کا ایک خط آیا جس میں "امداد الفتاویٰ" کے حوالہ سے اس مسئلہ کے متعلق حضرت تھانویؒ کی ایک خاص تحقیق کا ذکر کیا گیا تھا جس سے میں اس وقت تک واقف نہیں تھا ــــــ اس خط سے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی عالم دین ہیں۔ چنانچہ رجسٹر میں ان کے نام سے پہلے مولانا کا لفظ بڑھا دیا گیا۔ جب مولانا کے پاس "الفرقان" کا وہ پہلا شمارہ پہونچا جس میں ان کا نام "مولانا شیر محمد صاحب" لکھا گیا تھا تو ممدوح نے مجھے لکھا کہ میں عالم نہیں ہوں عامی ہوں۔ اکابر کی کتابیں دیکھنے کا شوق ہے۔ ان سے کچھ باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ اس لیے میرے نام کے ساتھ مولانا نہ لکھا جائے ــــــ ممدوح نے یہ بات ایسے انداز میں لکھی تھی جس سے دل میں ان کی خاص عقیدت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ ان کی زیارت حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی حیات میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں اور دوسری دفعہ ملک کی تقسیم سے کچھ ہی پہلے سکھر (سندھ) میں ہوئی۔ جبکہ اس عاجز نے ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ سندھ اور بلوچستان کے بعض مقامات کا دورہ کیا تھا جن میں سکھر بھی شامل تھا ــــــ ممدوح کو کسی طرح میری آمد کا علم ہو گیا تو از راہِ شفقت و عنایت خود ہی گھوٹکی سے سکھر تشریف لائے۔ ان دونوں ملاقاتوں سے عقیدت میں اضافہ ہوا ــــــ قیام پاکستان کے کچھ مدت کے بعد مولانا مدینہ طیبہ ہجرت فرما گئے۔ جس کا مجھے بہت عرصہ کے بعد علم ہوا۔ پھر ۱۳۶۱ھ یا ۶۲ھ میں مناسک حج پر ان کی ضخیم اور محققانہ تصنیف "عمدۃ المناسک" جس کو گجرات کے عالم دین مولانا غلام محمد نورگت نے شائع کیا تھا۔ مولانا غلام محمد صاحب ہی کے ہاتھ سے ملی۔ اس سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ممدوح کس پایہ کے صاحب نظر عالم اور محقق ہیں۔

پھر اب سے ۱۳ سال پہلے ۱۹۶۶ء میں جب اللہ تعالیٰ نے حج و زیارت کی نعمت نصیب فرمائی تو مدینہ طیبہ میں حضرت مولانا کی خدمت میں بار بار حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس حاضری میں مناسک کے بعض اہم مسائل کے بارہ میں حضرت سے جو استفادہ کیا گیا اور جو خاص عنایتیں ممدوح نے اس عاجز پر فرمائیں ان کا ذکر اسی زمانہ میں الفرقان کے شماروں میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد گزشتہ سال ۱۹۷۸ء کے حج کے موقع پر رابطۂ عالم اسلامی کے تعلق سے جب پھر حرمین شریفین کی حاضری کی نعمت رفیق محترم

مولانا علی میاں کی معیت میں نصیب ہوئی تو مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کی بھی الحمدللہ ہم دونوں کو بار بار توفیق ملی۔ ہمارا مشترک احساس و تاثر یہ تھا کہ اللہ نے اپنے اس بندہ کو تجرید و تفرید اور فنا تام کا خاص مقام نصیب فرمایا ہے، جو تھوڑا سا وقت حضرت کی خدمت میں گزرتا وہ ہمارے بہترین اوقات میں سے تھا۔ حضرت ممدوح نے اپنے لیے فقر و مسکنت کی زندگی اختیار فرمائی تھی۔ مشہور حدیث ہے "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستفتح بصعالیک المہاجرین" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خستہ حال اور مساکین مہاجرین کے وسیلے سے فتح کی دعا کرتے تھے) حضرت مولانا شیر محمد صاحب ہمارے اس زمانہ میں "صعالیک المہاجرین" کا ایسا نمونہ تھے کہ اس طرح کا کوئی دوسرا نمونہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، ان کے پاس بیٹھ کر دل دنیا سے سرد ہوتا تھا جو اہل اللہ کی خاص علامت ہے۔

پچھلے مہینہ محرم میں مکرمی مخدومی عبداللہ نور ولی مقیم جدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ ذی الحجہ میں حضرت مولانا کا وصال ہو گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) ان کی روح اپنے رب سے جا ملی اور ان کا جسم اس بقیع کے سپرد کر دیا گیا جو سب سے پہلے مدفون مہاجر عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہ سے لیکر اس وقت تک کے لاکھوں مہاجرین اور مومنین صالحین کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ حضرت مولانا شیر محمد صاحب بھی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے خلفاء کبار میں سے تھے۔

اس عاجز بندہ پر اللہ تعالیٰ کے بے حساب احسانات و انعامات ہیں۔ سے ایک عظیم احسان و انعام یہ بھی ہے کہ اس کے جن اچھے اور مقبول بندوں تک پہنچنا میسر ہوا بلا ادنیٰ استحقاق کے ان کی غیر معمولی عنایتیں اور شفقتیں نصیب ہوئیں اور اپنے گنہگار دل کو ان کی محبت و عظمت کا کچھ حصہ بھی ملا اگرچہ جو استفادہ ان سے کرنا چاہیے تھا اپنے قصور ہمت اور حرماں نصیبی کی وجہ سے وہ نہ کیا جا سکا، لیکن ان کی عظمت و محبت کے جو ذرے نصیب میں انشاء اللہ وہ کام آئیں گے۔

احب الصالحین ولست منہم لعل اللہ یرزقنی صلاحا

ناظرین کرام سے گزارش ہے کہ وہ ان دونوں مرحوم بزرگوں کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا فرمائیں اور حسب توفیق ایصال ثواب کریں۔ موت کے بعد خدمت اور تعلق کا یہی راستہ ہے اور اس میں انشاء اللہ اپنا بھی بڑا نفع ہے۔

محمد منظور نعمانی

حضرت مولینا شاہ وصی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ)

(شوال ۱۳۸۷ھ کے شمارہ میں شایع ہوا)

وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃ

ان سطروں کی اشاعت تک مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے سانحۂ وفات کی اطلاع اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ناظرین کو ہو چکی ہوگی، — آج ۲۵ر نومبر سے صرف ۵ ہی دن پہلے ۲۰ر نومبر کی صبح رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور یہ ناچیز مکہ معظمہ سے واپس آتے ہوئے بمبئی پہنچے تھے۔ قریباً ۱۰ بجے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، ۲۲ر نومبر کو حضرت اپنے خدام اور رفقاء کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ حج کے لئے مظفری جہاز سے جہاز پاک روانہ ہونے والے تھے، رمضان مبارک حرمین شریفین ہی میں گزارنے کا ارادہ تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں رہنے والے حضرت کے خاص محبین و مسترشدین حافظ محمد صدیق صاحب الیمنی (مقیم مکہ مکرمہ) اور مولانا مجداللہ گورکھپوری (مقیم مدینہ طیبہ) حضرت کے قافلہ کے قیام کے لئے جو انتظامات وہاں کر رہے تھے ان کا تذکرہ آیا اور وہاں کے جو خطوط حضرت کے نام ہمارے ساتھ آئے تھے وہ پیش خدمت کئے۔ اتفاق سے اسی دن بلکہ غالباً اسی وقت حضرت کے نام مدرسہ صولتیہ (مکہ مکرمہ) کے مہتمم جناب مولانا محمد سلیم صاحب کا مکتوب پہنچا جو ڈاک سے آیا تھا [illegible] انھوں نے مدرسہ ہی میں قیام فرمانے کی حضرت والا سے درخواست کی تھی،

وہ حضرت کے خادم خاص مولانا جامی نے ہمارے سامنے ہی خدمت میں پیش کیا، اور حضرت نے اس کو پڑھا ہم لوگوں نے بھی عرض کیا کہ مولانا محمد سلیم صاحب نے حضرت سے یہ درخواست کرنے کے لئے ہم سے بھی کہا تھا ۔۔۔ جتنی دیر حاضر خدمت رہے حسب عادت انتہائی شفقت وعنایت سے لطف اندوز ہوتے رہے، پھر رخصتی کی اجازت چاہتے ہوئے عرض کیا کہ جی تو چاہتا تھا کہ پرسوں حضرت کو رخصت کرنے کے بعد جائیں لیکن فلاں مجبوری سے جلدی لکھنؤ پہونچنا ضروری ہے، اس لئے کل صبح کے طیارہ سے روانگی کا ارادہ ہے حضرت نے فرمایا کہ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ آپ لوگ مجھے رخصت کرکے جائیں گے اور جی بھی چاہتا تھا لیکن جب ضرورت ہے تو کل ہی چلے جائیے۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے دعا کی درخواست کی اور حضرت نے بھی ہم سے فرمایا اور آخری مصافحہ کرکے قیام گاہ پر واپس آگئے،

میں حج سے متعلق اپنی دونوں کتابوں "آپ حج کیسے کریں" اور "آسان حج" کے کچھ نسخے حضرت کے قافلہ کے لئے پیش کرنا چاہتا تھا، میں نے مکہ معظمہ ہی سے "کتب خانہ الفرقان" کو لکھ دیا تھا کہ اتنے نسخے بمبئی روانہ کردیئے جائیں، لیکن میرے بمبئی پہنچنے تک کتابوں کا پارسل بمبئی نہیں پہنچا تھا اگرچہ بلٹی اسی دن مل گئی تھی، بہرحال وہ نسخے بمبئی ہی سے فراہم کئے گئے اور عشاء کے بعد ان کو لے کر پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت نے بڑی عنایت سے قبول فرمائے اور ساتھ لے جانے والے سامان میں رکھوا دیئے، یہ ۲۰ اور ۲۱ نومبر کے درمیان کی شب تھی اور حضرت کی خدمت میں اس عاجز کی یہ آخری حاضری تھی، حسب معمول رخصتی مصافحہ اور دعا کی درخواست کرکے واپس آگیا اور پروگرام کے مطابق ۲۱ نومبر کی صبح سورج نکلنے سے پہلے بمبئی سے دہلی کے لئے ہم لوگ روانہ ہوگئے۔ اس دن دہلی قیام رہا، اگلے دن ۲۲ نومبر کی صبح دہلی سے لکھنؤ اپنے مستقر پر آگئے،

۲۲ ہی کو مظفری جہاز سے حضرت اپنے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوگئے آج ۲۵ نومبر کو عصر کی نماز کے بعد افواہی طور پر یہ خبر سنی کہ محلہ ماہ نگر (لکھنؤ)

صاحب کو بمبئی سے کسی نے اطلاع دی ہے کہ مظفری جہاز پر حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا وصال ہو گیا۔ —— دل و دماغ یقین کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ جس کا بڑا سبب اپنا یہ خیال بھی تھا کہ اگر بمبئی میں اس طرح کی کوئی اطلاع آئی ہوتی تو بمبئی کے ہمارے وہ احباب و مخلصین جو حضرت سے عقیدت و محبت کا خاص تعلق رکھتے ہیں ہم لوگوں کو ضرور اطلاع دیتے، ہم لوگوں نے طے کیا کہ بمبئی ٹرنک کال کر کے تحقیق کی جائے، ابھی اس پر عمل نہیں ہو سکا تھا کہ اسی اثنا میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے بذریعہ فون اطلاع ملی کہ سیٹھ عبد الستار صاحب کا تار بھی بمبئی سے دار العلوم میں آیا ہے جس میں اس سانحہ کی اطلاع دی گئی ہے۔ اب ہم سب کو یقین کر لینا پڑا۔ بیشک جب انبیاء علیہم السلام بھی اس دنیا میں نہیں رہے تو کون رہے گا، بقا و دوام صرف ایک ذات کے لئے ہے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝

ان سطروں کی ابھی کتابت بھی نہیں ہو سکی تھی کہ بمبئی کے ایک مخلص حاجی یعقوب صاحب کے ۲۵ر نومبر کے لکھے ہوئے خط سے یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ حضرت کے رفقا کا مظفری جہاز سے بذریعہ وائرلیس دیا ہوا تار آج دن کے ۱۱ بجے بمبئی پہنچا جس میں بتایا گیا ہے کہ آج صبح ۶ بج کر ۵ منٹ[1] پر حضرت کا وصال ہو گیا۔ اور جہاز کے کیپٹن کا کہنا ہے کہ جہاز کے عام قانون و دستور کے مطابق نماز جنازہ پڑھ کر حضرت کی میت کو سمندر کے سپرد کر دیا جائے اور ہم لوگوں کا اصرار ہے کہ ہم محفوظ کر کے جدہ لے جائیں، آپ لوگ مغل کمپنی سے کیپٹن کو تار کے ذریعہ ہدایت بھجوائیے کہ وہ جدہ تک لے جانے کی اجازت دے اور انتظام کرے چنانچہ فوراً ہی اس کی کوشش کی گئی، مغل کمپنی نے منظور کر لیا اور جہاز کے کیپٹن کو بذریعہ وائرلیس اس کی ہدایت دے دی اور بمبئی کے اپنے دوستوں نے حضرت کے رفقا کو بذریعہ وائرلیس مظفری جہاز پر اطلاع بھیجدی کہ مغل کمپنی نے کیپٹن کو ہدایت دے دی ہے کہ وہ حضرت کی میت کو جدہ تک لے جانے کا انتظام کرے اور ایک تار سعودی

---

[1] یعنی صبح صادق سے کچھ پہلے کیونکہ سمندر کے جس علاقہ میں اس وقت مظفری جہاز جا رہا تھا وہاں صبح صادق ۶ بجکر ۹ منٹ کے قریب ہوتی ہے۔

عربیہ میں حکومت ہند کے سفیر مسٹر مدحت کامل قدوائی کو بھی دے دیا گیا ہے۔" (حاجی یعقوب صاحب کا یہ خط ۲۰ر نومبر کو لکھنؤ پہنچا)

امید ہے کہ پروگرام کے مطابق ۲۹ر نومبر چہار شنبہ کو مظفری جہاز جدہ کے ساحل پر پہونچے گا لیکن حجاز مقدس کے حضرت کے محبین و معتقدین جو بڑی تمناؤں اور مسرتوں کے ساتھ جدہ میں حضرت کے استقبال کی اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حضرت کے قیام کی تیاریاں کر رہے تھے حضرت کے اس جسد عنصری کو جہاز سے اتاریں گے جس سے بے تاب روح سبقت کرکے ملاءِ اعلیٰ کی طرف پہلے ہی پرواز کر چکی ہے —— اللہ تعالیٰ ان کو اور حضرت کے تمام ہی محبین و متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی ۝

اضافہ شدہ نوٹ:۔

لیکن قضا و قدر کا فیصلہ یہ تھا کہ حضرت کی میت حجاز مقدس کے ساحل پر سمندر ہی میں دفن ہو —— واقعہ یہ ہوا کہ حکومت ہند کے سفیر مدحت کامل قدوائی اور بعض دوسرے حضرات کی استدعا اور غیر معمولی کوششوں کے نتیجہ میں سعودی حکومت نے تو (وہاں کے دستور کے خلاف) اس کی اجازت دے دی کہ حضرت کی میت کو جدہ کی بندرگاہ پر اتارا جائے اور مکہ معظمہ میں دفن کیا جائے لیکن اس اجازت کی اطلاع جہاز کے کیپٹن کو نہیں ہو سکی اسلئے جب جہاز جدہ کے ساحل پر پہنچا تو کیپٹن نے حضرت کے وارثین اور رفقاء سے کہا کہ قانون کی رو سے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میت کو بندرگاہ پہنچنے سے پہلے ہی سمندر کے سپرد کر دیا جائے —— چنانچہ ایسا ہی کرنا پڑا۔ یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ وانزل علیہ شآبیب رحمتک ورضوانک (نعمانی)

محمد منظور نعمانی

حضرت العلامہ مولینا محمد ابراہیم بلیاویؒ

(شوال ۱۳۸۷ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرۃ الاستاذ العلامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے حادثۂ وفات کی اطلاع ہمارے ناظرین کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ہو چکی ہوگی ــــ یوں تو اس سے پہلے ان کے بڑے اور ان سے بہت بڑے بھی جا چکے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ دار العلوم دیوبند اور جماعت دیوبند میں ان کی وفات سے، خاص کر علم و تدریس کی کائنات میں جیسا عظیم خلا محسوس کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے ایسا غالباً پہلے کبھی محسوس نہیں کیا گیا۔

علمی اور تدریسی امتیاز کے علاوہ دار العلوم کی قریباً ایک سو پانچ سالہ تاریخ میں شاید ہی اس کے کسی استاد کو اتنی طویل مدت تک درس دینے کا موقع ملا ہو جتنا اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا۔

آج سے ٹھیک پینتالیس (۴۵) سال پہلے جب یہ ناچیز ایک طالب علم کی حیثیت سے دار العلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا اس وقت بھی حضرت علامہ مرحوم وہاں کے بڑے اساتذہ میں تھے، اور ہمارے مدارس کی اصطلاح میں "معقولات" یعنی منطق، فلسفہ، اور علم کلام کی مشکل ترین اور انتہائی کتابیں "حمد اللہ" "قاضی مبارک" "شمس بازغہ"، اور "امور عامہ" وغیرہ اکثر ان کے ہاں ہوتی تھیں ــــ

یہ ناچیز چونکہ معقولات کی یہ سب کتابیں پڑھ کر دار العلوم گیا تھا اس لئے ان کے یہاں ہونے والے ان فنون کے کسی سبق میں میری شرکت نہیں تھی، لیکن معقولات کے ساتھ اپنی مناسبت اور اپنے ذہنی

رابطہ کو محفوظ رکھنے کے لئے چند اور ایسے طلبہ کے ساتھ مل کر جو معقولات کی تکمیل کر چکے تھے کوشش کی کہ منطق یا فلسفہ کی کوئی غیر نصابی اہم کتاب مولانا سے اوقات مدرسہ کے علاوہ "خارج وقت" میں پڑھی جائے، یہ کوشش کامیاب ہوگئی، اور مولانا نے فنون سے خاص دلچسپی ہی کی وجہ سے "شرح اشارات طوسی" خارج میں پڑھانا منظور فرمالیا اور طے ہوا کہ صبح مدرسہ کا وقت شروع ہونے سے پہلے مولانا ہی کی درسگاہ میں یہ سبق ہوا کرے گا ـــــ سبق شروع ہوا اور ایک مدت تک اس کا سلسلہ جاری رہا ـــــ اب اس واقعہ کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کہ منطق وفلسفہ کی کتابیں میں نے خاص دلچسپی اور محنت سے ایک ایسے استاذ (حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ) سے پڑھی تھیں جو معقولات میں خیرآبادی سلسلہ کے شاگرد تھے اور ان فنون میں خاص دستگاہ رکھتے تھے، اس لئے مجھے اس کی کچھ زیادہ امید نہیں تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے کسی استاذ سے میں معقولات کی لائن میں کوئی قابل قدر استفادہ کرسکوں گا، (کیونکہ دارالعلوم کی خاص شہرت درس حدیث کے لحاظ سے تھی) ـــــ لیکن چند ہی سبق پڑھنے کے بعد اندازہ ہوگیا کہ مولانا ان فنون میں بلاشبہہ اپنے وقت کے امام ہیں اور استفادہ کی بڑی گنجائش ہے۔

دارالعلوم دیوبند جانے سے پہلے میں اگرچہ معقولات کی تمام درسی بلکہ بعض غیر درسی کتابیں بھی پڑھ چکا تھا لیکن دینیات سے بالکل کورا تھا، مشکوٰۃ تک نہیں پڑھی تھی، اس لئے اس سال مجھے مشکوٰۃ المصابیح بھی پڑھنی تھی، اس زمانہ میں دارالعلوم میں اس کا سبق حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کے ہاں ہوتا تھا ـــــ جس سال یہ ناچیز دارالعلوم دیوبند پہنچا ہے وہ پہلا سال تھا کہ مشکوٰۃ کی جماعت دو حصوں میں تقسیم کردی گئی تھی اور ایک جماعت کا سبق حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کے ہاں رکھا گیا تھا۔ اسباق شروع ہوگئے اور دفتر دارالعلوم کی طرف سے وہ نقشہ دیر تک نہیں ہوا جس سے معلوم ہوتا کہ کس طالب علم کا نام کس استاذ والی جماعت میں ہے۔ "معقولات" کی لائن سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کے ساتھ جو ایک خاص ذہنی مناسبت تھی اس کی وجہ سے انہی کے درس مشکوٰۃ میں شرکت شروع کردی۔ کتاب الایمان پوری حضرت مولانا ہی سے پڑھی، چند ہفتوں کے بعد دارالعلوم کے دفتری نقشہ میں میرا نام مولانا سراج احمد صاحب کے ہاں پڑھنے والی جماعت میں آگیا اور میں وہاں منتقل ہوگیا۔ لیکن "ایمان" سے متعلق مباحث پر حضرت مولانا سے چند ہفتوں تک

جو کچھ سنا تھا وہ اپنی معقولیت، سلجھاؤ اور دلپذیری کی وجہ سے ایسا ذہن نشین ہوا کہ الحمد للہ آج تک محفوظ ہے۔

میری معلومات کے مطابق یہ پہلا سال تھا جس میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب نے دارالعلوم میں حدیث کا درس دیا، اس کے بعد سے قریب قریب مسلسل حدیث کا کوئی نہ کوئی سبق رہا، مسلم شریف تو بہت عرصہ تک انہی کے ہاں ہوتی رہی۔ پھر حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جب مولانا ہی ان کی جگہ صدر مدرس قرار دیئے گئے تو جامع ترمذی بھی آپ ہی کے ہاں ہونے لگی، جو درسی نقطہ نظر سے صحاح ستہ میں اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔

حضرت علامہ مرحوم جامع ترمذی کے درس کی ذمہ داری سے کافی پہلے اس پر ایک مبسوط و مفصل حاشیہ لکھنے کا کام شروع کر چکے تھے اور جہاں تک اس عاجز کو معلوم ہے اب سے کئی سال پہلے اس کا کافی حصہ ہو چکا تھا، غالباً حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد صدر مدرسی اور نظامت تعلیم کی دوہری ذمہ داریاں آپڑنے کی وجہ سے وہ کام تسلسل کے ساتھ جاری نہیں رہ سکا اگر یہ کام مکمل ہو جاتا تو مولانا مرحوم کا وہ غالباً واحد تصنیفی کام ہوتا اور اس سے باہر کے لوگ بھی ان کے مقام علمی کا اندازہ لگا سکتے — وکم حسرات فی بطون المقابر

حضرت مولانا پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ان کے تلامذہ کی بے پناہ کثرت ہے، گذشتہ پچاس ساٹھ سال کی طویل مدت میں جو ہزارہا طلبہ دارالعلوم دیوبند سے عالم و فاضل ہو کر نکلے جو ہندوستان و پاکستان میں یا کسی دوسرے ملک میں مختلف قسم کی دینی خدمات انجام دے رہے ہیں (اور کم از کم برصغیر ہند و پاکستان میں تو دین کی جو روشنی ہے اس میں بلاشبہ زیادہ حصہ انہی فضلاء دیوبند یا ان کے تلامذہ کا ہے) ان میں کوئی شاذ و نادر ہی ایسا ہوگا جو حضرت مولانا کا براہ راست یا بالواسطہ شاگرد اور فیض یافتہ نہ ہو۔ ان میں سے جس نے بھی حضرت مولانا کی خبر وفات سنی ہوگی ضرور ہی رحمت و مغفرت کی دعا بار بار کی ہوگی اور کرتے رہیں گے۔ ان میں کتنے عالم باعمل اور اولیاء اللہ بھی ہوں گے، کتنوں نے مختلف شکلوں میں ایصال ثواب کا اہتمام بھی کیا ہوگا — کیسے خوش نصیب ہیں وہ بندے جو اپنے پیچھے اس طرح کے سلسلے چھوڑ کے جائیں — وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝

اپنے ناظرین کرام سے راقم سطور کی التجا ہے کہ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی اہتمام سے دعا فرمائیں۔ اس عاجز پر کرم و احسان ہوگا۔

• عتیق الرحمٰن سنبھلی

دو محسنوں کی وفات

(محرم ۱۳۸۹ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

گذشتہ مہینے دو محسنوں سے محرومی ہوئی، یعنی شفاء الملک حکیم عبد المعید صاحب لکھنوی اور مولوی فہیم الدین صاحب (میرٹھی) نے علی الترتیب ۹ ذی الحجہ اور ۱۱ ذی الحجہ کو ملک آخرت کی راہ لی۔ مالک الملک سے دعا ہے کہ انھیں رحمت و مغفرت سے نوازے اور ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

شفاء الملک حکیم عبد المعید صاحب لکھنؤ کے مشہور خاندان اطباء جھوائی ٹولہ کی بزرگ ترین یادگار تھے۔ کوئی ۶۵ سال مطب فرمایا اور قریب پچاسی برس کی عمر پائی۔ الفرقان کے خریداروں میں ان کا نام نامی ایک مدت سے تھا۔ مگر اب سے چند سال پہلے تک میرے لیے وہ تقریباً ایک اجنبی شخصیت تھے۔ ۱۹۶۴ء میں مجھ پر سخت اعصابی ضعف کا حملہ ہوا اور رہ رہ کر اس کا اعادہ ہوتا رہا۔ ۱۹۶۶ء کی گرمیوں میں یہ حالت ہو گئی کہ دوا علاج بیکار محسوس ہونے لگا۔ والد ماجد بار بار معالجہ کی طرف متوجہ فرماتے اور میں ایک یاس کی کیفیت کے ساتھ ٹالتا جاتا۔ حتیٰ کہ بستر سے اٹھنا مشکل ہو گیا۔ حکیم صاحب قبلہ سے رجوع کی نوبت اب تک نہ آئی تھی، والد ماجد نے اصرار سے فرمایا کہ اب کی ان سے رجوع کر کے دیکھا جائے۔ اور پھر ایک دن (غالباً ۱۴ر جون ۱۹۶۶ء کو) حکیم صاحب کے مطب میں حاضری عمل میں آہی گئی۔ والد ماجد نے تعارف کرایا کہ الفرقان کی تمام ذمہ داری ایک عرصہ سے اسی نے اٹھا رکھی تھی مگر اب ڈھائی سال سے ضعف اعصاب کی یہ کیفیت چل رہی ہے کہ کسی علاج یا تبدیل آب و ہوا سے کیسا ہی فائدہ ہو جائے لیکن ادھر کچھ کام کیا اور

اِدھر عوارض لوٹنا شروع ہوئے۔ حکیم صاحب نے بڑی شفقت سے نسخہ تجویز فرمایا اور علاج شروع ہو گیا۔

علاج کا یہ سلسلہ تقریباً ایک سال نہایت پابندی سے جاری رہا۔ ہر ہفتے یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہفتے کے بعد حاضری ہوتی تھی۔ مطب کا وقت میری کمزوری کے اعتبار سے خصوصاً موسم گرما میں نہایت ہی سخت تھا، یعنی گیارہ سے ایک تک۔ اور عموماً حکیم صاحب کی تشریف آوری گیارہ کے بعد ہی ہوتی تھی، پھر مطب کا فاصلہ بھی کوئی ڈیڑھ میل۔ غرض یہ آمد و رفت سخت دشوار تھی اور ہوتے دنوں کا بہت ہی ہوشربا ہوتی تھی۔ مگر حکیم صاحب کی طرف سے جس عنایت و کرم اور شفقت و التفات کا معاملہ رہتا اس کی خنکی نے کبھی اس کلفت کے آگے ہمت کو پست نہ ہونے دیا، کہ حسب ہدایت حاضری میں فرق پڑتا۔ میں حاجتمند تھا اور وہ کرم فرما، دوسرے فیس پیش کرتے تھے اور مجھ سے فیس بھی نہیں لی جاتی تھی لیکن التفات و کرم کا یہ عالم تھا کہ ادھر نظر پڑی اور ان کی یہ خواہش ہوئی کہ سب کو چھوڑ کر پہلے مجھے دیکھ لیں۔ کچھ دیر لگتی تو بیچ میں ایک دو بار معذرت آمیز جملے زبان پر آجاتے۔ عمر اور عزت کے اعتبار سے میرے بزرگوں کے بزرگ تھے مگر ایسی تواضع سے پیش آتے کہ شرم آئے۔ حال کہنے کی قریب والی کرسی پر پہنچتا تو عموماً مصافحہ کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ پھر اس قدر شفقت بھرے لہجے میں حال پوچھتے جیسے کسی عزیز سے مخاطب ہیں۔ حال اچھا ہوتا تو زبان پر "الحمد للہ" اور چہرہ پر مسرت نمایاں ہو جاتی وہ مسرت نہیں جو ایک معالج کو اپنی کامیابی سے ہوتی ہے بلکہ وہ مسرت جو ایک شفیق بزرگ کو اپنے کسی عزیز کی راحت سے ہوتی ہے ــــــ کچھ تکلیف بتاتا تو اسی طرح اس کا تاثر چہرہ پر آجاتا۔ اور پھر نسخہ میں ترمیم فرما کر بڑے دلنواز انداز میں فرماتے کہ انشاء اللہ اس سے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی، اب یہ تکلیف نہیں رہے گی۔ اور پھر اسی کریمانہ انداز سے رخصت کرتے جس سے شروع میں پیش آئے تھے۔

حکیم صاحب کے علاج کا یہ سلسلہ پوری پابندی اور تسلسل کے ساتھ تقریباً سال بھر چلا۔ اور اس میں موصوف نے اپنے ایک خاص تدریجی نقشہ پر معالجہ کی تکمیل فرمائی لیکن اس کے بعد والے سال میں بھی وقتاً فوقتاً ضرورت پڑنے پر حاضر خدمت ہوتا رہا۔ اس

دو سال کی آمد و رفت میں کبھی ایک بار بھی تو ایسا نہیں ہوا کہ حکیم صاحب کے لطف و التفات میں کوئی فرق محسوس ہوا ہو۔ جب جائیے وہی شفقت، وہی کرم، وہی انبساط اور وہی انشراح کہ محض مریض اور معالج کا رشتہ ہی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ میری حاضری بھی، چاہے کیسے ہی سخت دن ہوں، محض ایک مریض کی مجبورانہ حاضری نہیں ہوتی تھی بلکہ اس میں وہ لذت پیدا ہو گئی تھی جو کسی سراپا شفقت و کرم بزرگ کے پاس آنے جانے میں پیدا ہو جانی چاہیئے۔ اور اسی کی بدولت اس نفع مند علاج میں وہ پابندی مجھ سے ہو سکی جو بغیر اس کے یقیناً میرے لیے آسان نہ تھی ——— میرے مرض کی جڑ اگرچہ حکیم صاحب مرحوم کے علاج سے بھی نہ کٹ سکی مگر اتنا ضرور ہو گیا کہ اعصابی ضعف سے جو رہ رہ کر قلبی دورہ کی شکل پیدا ہو جاتی تھی اور معاملہ جان پر بنجاتا تھا وہ بحمد اللہ اس علاج کے بعد سے نہیں ہوئی۔

خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اس حسن کرم اور محض لوجہ اللہ شفقت و محبت کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔ اپنی معلومات کی حد تک وہ اپنے رب کے اطاعت شعار اور نہایت عبادت گزار بھی تھے۔ مریضوں کے دیکھنے اور انسانی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ ان کے اوقات عموماً اوراد و وظائف اور تلاوت و عبادات سے بھرے ہوئے تھے۔ مرنجان مرنج تھے۔ ثقاہت و متانت اور شرافت ان کی وضع تھی بے ضرورت باتیں کرتے ان کو نہیں دیکھا۔ نسخہ تحریر فرماتے وقت "بسم اللہ الشافی" اس طرح ڈوب کر کہتے جیسے اتنی دیر کے لیے منقطع ہو گئے ہوں۔ عقائد میں نہایت صاف اور جادۂ حق کے شیفتہ تھے۔ دنیا سے جاتے وقت بھی حال تھا جو ایک صاحب حسنِ عمل مومن کا ہونا چاہیئے[1]۔ اپنے ساتھ ان کے اس محبت آمیز برتاؤ کا سراغ اُن کے اندر سے پانے کی کوشش کی تو منجملہ دیگر وجوہ کے ایک خاص وجہ یہ محسوس ہوئی کہ وہ الفرقان کے مطالعہ میں والد ماجد کے سلسلہ معارف الحدیث کو شغف کی حد تک قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور حدیث سے شغف رکھنے والوں کا حسن خاتمہ ایک عام تجربہ ہے۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ واجعل الجنۃ مثواہ واجزہ احسن ما تجزیہ عبادک المحسنین۔

حکیم صاحب کی اولاد میں چار صاحبزادیاں ہیں، دیگر پسماندگان میں چھوٹے بھائی شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب (سابق پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ) بھی ہیں۔ اور وہی

---

[1] اس بارے میں وصیت کا بھی اہتمام فرمایا کہ کوئی غلط رسم ادا نہ کی جائے جس کا لکھنؤ کے روادارانہ ماحول میں صحیح العقیدہ لوگوں سے بھی ڈر ہوتا ہے۔

اب مرحوم کے جانشین ہیں، ریٹائر ہونے کے بعد سے لکھنؤ ہی میں قیام فرما ہیں۔ موصوف خود میرے والد ماجد کے بڑے محب اور میرے گھرانے کے بڑے طبی محسن ہیں وہ حکیم صاحب مرحوم کے بھائی ہی نہیں بلکہ بمنزلہ اولاد تھے۔ حکیم صاحب نے گو عمر طبعی میں وفات پائی مگر ایسے شفیق الطبع بزرگوں کی جدائی کسی عمر میں بھی ہو بہت شاق ہوتی ہے اللہ تعالیٰ حکیم عبداللطیف صاحب اور دیگر پسماندگان کو اس صدمہ پر صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔

مولوی فہیم الدین صاحب

مولوی صاحب مرحوم ہاپڑ ضلع میرٹھ کے ایک زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے، حافظ قرآن اور دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے، ایک عرصہ تک اپنے وطن ہی کے ایک عربی مدرسہ میں درس و تدریس کی خدمات اعزازی طور پر انجام دیں پھر کاروبار میں لگ گئے۔ لکھنؤ کی مشہور اسلحہ فروش فرم الٰہی بخش اینڈ کمپنی ان کی ملکیت تھی اور عرصہ دراز سے لکھنؤ ہی میں قیام تھا اتنی بڑی تاجرانہ حیثیت کے باوجود تاجرانہ خو بو نام کو نہیں تھی۔ نرمی اور خاموشی، وقار اور سنجیدگی کی تصویر، برسوں قریب سے دیکھا، علاوت ہی علاوت شہر میں مسلمانوں کے دینی اور سماجی کاموں میں بڑے حوصلہ سے حصہ لیتے تھے مگر بے حد بے ریائی اور خاموشی کے ساتھ۔ ان کا حصہ بیشتر مالی امداد کی شکل میں ہوتا تھا غرض وہ گفتار اور لن ترانی سے انھیں کوئی مناسبت نہ تھی علمی اور دینی موضوعات پر گفتگو کرتے تو انھیں کبھی نہیں پایا لیکن اخلاق و عادات میں علم دین کا پورا پورا اثر تو ہمیشہ دیکھا۔ نہ عالم ہونے کا احساس کسی بات سے ٹپکتا تھا نہ مالی حیثیت کے احساس کی غمازی کہیں سے ہوتی تھی۔ ایک سادہ اور بھاری شخصیت، کہ ہر آدمی برابر کا سمجھ کے بات کرے۔ شہر کے وہ دینی اور ملی کام کرنے والے جن کے خلوص و دیانت پر مولوی صاحب مرحوم کو اعتماد تھا ضرورت کے ہر موقع پر ان کی مالی اعانت کا بھروسہ رکھتے تھے، خواہ قرض کی شکل میں ہو یا عطیہ کی۔ ان کی دکان کیا تھی، ایسے لوگوں کے لیے ایک ملی بینک تھا جہاں سے ہر وقت اسکی وسعت کے بقدر اس طرح قرض مل سکتا تھا جیسے یہ مولوی صاحب کی ذاتی ملکیت نہ ہو بلکہ قومی امانت

ہو۔ خود الفرقان بھی ان کی اس شرافت و للّٰہیت کے منت کشوں میں ہے جب کبھی ضرورت ہوئی تو بس سادہ سے دو جملے ٹیلیفون پر کہدئے اور عموماً مولوی صاحب کا آدمی ہی روپے پہونچا گیا۔

عام حاجتمندوں کی امداد و اعانت میں ان کے ہاتھ کی وسعت کا علم اللہ ہی کو ہوگا۔ مگر مجمل طور پر اتنا اندازہ ہے کہ وہ مال کے بارے میں وَاٰتُوْھُمْ من مالِ اللّٰہِ الَّذِیْ اٰتاکُم[۱] کا ذہن رکھتے تھے۔ کسی حاجتمند کی حاجت براہ راست اسے سامنے آئے یا کسی قابلِ اعتماد شخص کے ذریعہ اس کا علم ہو وہ اپنے اوپر واجب سمجھتے تھے کہ اس کی مدد کریں، اور وَفِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ[۲] کے زمرہ میں داخل ہوں صرف وقتی مدد نہیں بلکہ بیواؤں یتیموں اور معذوروں کے بعض مستقل ماہانہ وظیفے بھی ہمارے علم میں ہیں۔ اگرچہ ان کے اخفاء کا تو یہ عالم تھا کہ شاید وظیفہ پانے والے آج تک نہ جانتے ہوں کہ کہاں سے آرہا ہے۔

حافظ قرآن تھے اور اچھا یاد تھا خصوصاً پڑھتے تو بہت ہی اچھا تھے۔ سادہ اور نہایت صحیح، مخارج کی ادائیگی میں بڑی پختگی۔ دس سال سے میرا قیام بھی ان کے پڑوس میں تھا۔ محلہ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو چند آدمیوں کے دم سے آباد ہے وہ پابندی کے ساتھ تراویح میں قرآن سناتے تھے۔ آٹھ بجے دوکان بند کرا کے آتے اور پھر چند منٹ رک کر مکان سے سیدھے مسجد چلے جاتے، کھانا ناشتہ بعد میں کرتے —— ان دنوں بلکہ رمضان کے پورے مہینے میں فجر کی نماز بھی اسی مسجد میں پڑھتے۔ روزانہ کچھ دیر ساتھ کا موقع پورے سال میں اسی مبارک مہینے میں ملتا تھا۔ اور اس کے لیے وقت نماز فجر کے بعد کا تھا کہ مسجد سے نکلے اور میرے ساتھ میرے مکان سے کچھ آگے بڑھ کر امین الدولہ پارک تک چہل قدمی کی۔ طبیعت

---

[۱] اور دو حاجتمندوں کو اللہ کے اس مال میں سے جو اس نے تم کو دیا ہے۔ (قرآن)

[۲] اور اللہ کے فرماں بردار بندوں کے مالوں میں حق ہوتا ہے (یعنی وہ حق سمجھتے ہیں) مانگنے اور نہ مانگنے والے سب حاجتمندوں کا۔ (قرآن)

میں سادگی کا جو ذکر اوپر کیا ہے اس کا یہ عالم تھا کہ مجھے اگر کچھ آگے بڑھ کر کسی دن دودھ لینا ہوتا تو ساتھ چھوڑتے نہیں تھے بلکہ اصرار کرکے وہاں تک ساتھ جاتے تھے۔

اللہ غریق رحمت کرے اپنے تجربہ میں تو وہ فرشتہ صفت انسان تھے صرف چوّن برس کی عمر پائی، صحت اچھی اور جسم بھرا ہوا تھا۔ عید الضحیٰ سے دو دن پہلے فلو ہوا عید کو اچھے رہے دوسرے دن اور اچھے تھے کہ نو بجے صبح دل کا حملہ (ہارٹ اٹیک) ہوا۔ جو اتنا سخت تھا کہ ڈاکٹروں نے شروع ہی سے مایوسی ظاہر کر دی۔ اللہ نے انھیں سب کچھ دیا تھا دوسرے دن صبح تک قیمتی سے قیمتی علاج ہوا۔ دو دو ڈاکٹر رات میں ان کی تیمارداری کو رہے مگر وقت پورا ہو گیا تھا۔ حکم الٰہی کے آگے کسی کی نہ چلی۔ اور صبح ۸ بجے کے قریب روح جسم سے جدا ہو گئی۔ رہے نام اللہ کا! کیسے دیکھتے دیکھتے مولوی صاحب آخرت پاک کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اللہ ان سے جنت میں ملاقات نصیب کرے۔ وہ یقیناً ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

مولوی صاحب کی یادگار تین بچے ہیں دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی پسماندگان میں عزیز و اقارب کے وسیع حلقے کے ساتھ اہلیہ بھی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے صدمے کو، جو بعض وجوہ سے ان کے لیے بہت ہی سخت ہے، ہلکا کرے۔ انھیں دنیا میں راحت سے رکھے اور جنت النعیم میں پھر ملنا مقدر فرمائے۔ اور اصل ملنا تو وہیں کا ہے جس کے بعد پھر جدائی کا خطرہ ہی نہیں۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ لَوْکُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ [1]

جی چاہتا تھا کہ گزشتہ الفرقان ہی میں اپنے ان دو محسنوں کی تعزیت کی جائے مگر سال بھر کے قریب ہو گیا ہے کہ لکھنے سے طبیعت کو سخت اِبا ہے لکھنے کی محنت سے اچھی خاصی طبیعت اتنی بار بگڑ چکی ہے کہ اب اس کا تصور بھی طبیعت کو گراں ہوتا ہے کوئی چیز کسی سخت ضرورت یا اندرونی خواہش سے لکھنا ہی پڑے تو کئی دن کی کوشش سے طبیعت ہموار ہوتی ہے اور اتنی گنجائش گزشتہ اشاعت کے وقت میں نہیں تھی۔ مجبوراً موخر کرنا پڑا اگرچہ دل کو یہ تاخیر بہت ہی شاق تھی۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ دونوں حضرات کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا فرمائیں کہ الفرقان میں تذکرہ کا مقصد یہی ہے۔

---

[1] آخرت کی زندگی ہی۔ اگر تم جانتے ہو تو اصل زندگی ہے۔ (قرآن)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

حضرت مولانا عبدالغفور نقشبندی مہاجر مدنیؒ

(جمادی الاولیٰ ۱۳۸۹ھ مطابق اگست ۱۹۶۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا)

[حضرت مولانا عبدالغفور صاحب نقشبندیؒ نے گزشتہ مئی میں مدینہ منورہ ہی میں وصال فرمایا، اتفاق سے رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان دنوں مدینہ طیبہ ہی میں تھے، موصوف سے میں نے درخواست کی تھی کہ حضرتؒ کی وفات پر ایک نوٹ الفرقان کے لیے لکھ دیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا نے درج ذیل مختصر مضمون سپردِ قلم فرما دیا ——— نعمانی]

یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ حجاز مقدس اور حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً وتعظیماً اسلام کا مبدء و معاد، ہر مسلمان کا ملجا اور ماویٰ اور ہر دینی و دنیاوی نعمت کا مخزن ہے۔ یجبیٰ الیہ ثمرات کل شیٔ، اس لیے کسی دور میں وہ باکمال شخصیتوں، اہلِ قلوب اور اصحاب دعوت وارشاد سے خالی نہیں رہے۔

ایسا بھی بہت ہوا ہے کہ اہلِ قلوب اور مشائخ کبار نے زندگی کا بیشتر حصہ دیارِ عجم میں صرف کیا پھر اسی بلدامین یا جوارِ رسولؐ میں آکر پناہ لی اور اپنی زندگی کے آخری دن یہیں بسر کیے۔ دورِ قدیم میں شیخ تاج الدین سنبھلیؒ، شاہ صبغت اللہ بھروچیؒ، سید آدم بنوریؒ اور اس صدی کی ابتدا میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور مولانا عبدالحق الٰہ آبادی شیخ الدلائل کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اقبال مرحوم نے اپنے ان دو مشہور شعروں میں ان سب حضرات کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے۔

دریں پیری رہِ یثرب گرفتم   غزل خواں از سرورِ عاشقانہ

چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام — کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

ایسی متعدد شخصیتوں کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے کسی اشارۂ غیبی یا تقاضائے قلبی سے حرمین شریفین ہی کو اپنی خدمت و دعوت کا مرکز بنایا اور انھوں نے وہاں بیٹھ کر عالمِ اسلام کے دور دراز گوشوں سے آنے والوں کی روحانی و باطنی اصلاح و رہنمائی کا فرض انجام دیا۔ اور اس طرح ان کا فیض دور دور پہونچا۔ انہی خوش قسمت اور عالی ہمت افراد میں حضرت مولانا عبدالغفور عباسی مجددی مدنی بھی تھے جنھوں نے گزشتہ ربیع الاوّل کے اوائل میں اس جہانِ فانی سے کوچ فرمایا اور بقیع کی خاکِ پاک کو اپنا آخری مسکن بنایا۔

مولاناؒ علاقہ سوات کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم صوبہ سرحد سے حاصل کر کے دہلی آئے۔ مدرسہ امینیہ میں تکمیل کی، پھر وہیں سالہا سال تدریس کے فرائض انجام دیے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کے تلمذ پر مولانا کو فخر تھا۔ مولانا کو زمانۂ طالب علمی ہی میں کمالاتِ باطنی اور تزکیہ و تربیت کا ذوق تھا۔ اس سلسلے میں آپ طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت فضل علی شاہ صاحبؒ قریشی سے بیعت ہوئے اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ اپنی فطری استعداد اور مناسبت خداداد سے بہت جلد ایسا امتیاز پیدا کر لیا کہ ان کی اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ پھر بعض اشارات و مبشرات کی بنا پر مدینۂ طیبہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں آستانۂ رسالت پناہی پر پڑ کر خلق اللہ کی خدمت اور نفوس و قلوب کی اصلاح و تربیت میں مصروف ہو گئے۔ اُس عالم گیر انقلاب کی بنا پر، جو سارے عالمِ اسلام پر محیط ہے ——— اور حجازِ مقدس کے مخصوص حالات کی بنا پر خاص طور پر اصلاحِ باطن اور تعلق مع اللہ کی دعوت دینے والوں سے یہاں کی فضا روز بروز نامانوس ہوتی جا رہی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ سلاسل و طرق کے ساتھ نسبت رکھنے والوں کو بہت سی مشکلات اور بدگمانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔ مولانا عبدالغفور صاحبؒ نے اس شک و شبہ کی فضا میں اپنا کام شروع کیا اور بہت جلد ان کی ذات اور ان کی قیام گاہ طالبینِ اصلاح کا مرکز

بن گئی اور رفتہ رفتہ یہ فیض ہندوستان و پاکستان کے حجاج و زائرین سے تجاوز کر کے مصر و شام و ترکی و ترکستان تک عام ہو گیا۔ لوگ حج کے زمانے میں اور اس کے بعد آپ کے حلقے میں شریک ہوتے تھے اور اجازت سے مشرف ہو کر ان ملکوں میں خلق خدا کی خدمت اور طریقے کی اشاعت میں مصروف ہیں آخری دور میں آپ اکثر پاکستان تشریف لے جاتے۔ آپ کی مقبولیت اور مدینہ طیبہ کی نسبت کی وجہ سے آپ کی ذات کی طرف رجوع عام شروع ہوا اور کثرت سے لوگ آپ کی ذات سے مستفید ہوئے۔

آخری اسفار میں تو یہ حال تھا کہ آپ کی مجلس میں شریک ہونے والوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہوتی تھی لاؤڈ اسپیکر کے بغیر آواز نہیں سنی جا سکتی تھی۔ معتقدین اور ارادت مندوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ تھا۔ آپ اصلاح باطن کے ساتھ اصلاح ظاہر کی طرف شدت سے متوجہ تھے۔ غیر شرعی وضع کی اصلاح اور نصاریٰ و فرنگیوں کے شعائر کے ازالے پر بہت زور دیتے تھے۔

راقم السطور سے خود فرماتے تھے کہ نکٹائیاں اس کثرت سے اتاری جاتیں کہ ٹوکرے بھر بھر کے پھینکنے کی نوبت آتی۔ صدہا نوجوان اور تعلیم یافتہ حضرات نے اس غیر شرعی وضع اور فرنگیوں کی تقلید سے توبہ کی، داڑھیاں رکھیں اور نماز روزے کے پابند ہوئے۔

راقم سطور اور رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر الفرقان) پر شروع سے مولانا کی عنایت اور نظر شفقت رہی۔ راقم سطور کو ۱۹۴۷ء میں پہلی حاضری کے موقع پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ دن اور آخری دن مولانا کی شفقت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ جب کبھی مدینۂ طیبہ کی حاضری کے موقع پر حاضری میں کچھ تاخیر ہو جاتی تو شکایت فرماتے اشتیاقِ ملاقات کا اظہار کرتے۔ غائبانہ بھی شفقت فرماتے رہتے تھے۔

مولانا نعمانی کی تصنیف معارف الحدیث کے سلسلے سے مولانا کو بڑی مسرت تھی۔ کئی بار اس سے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میں اس کا بڑے اہتمام سے مطالعہ کرتا ہوں۔ تبلیغی جماعت کے افراد کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور اس کام کو بہت سراہتے۔ تبلیغی جماعت کے اکابر

گزشتہ مہینے میں مولانا علی میاں بعض رفقاء کے ساتھ ایک دن کے لیے بھوپال حضرت کی مجلس میں حاضر ہوئے تھے۔ حضرت علیہ الرحمہ کی مجلس میں یہ مولانا کی آخری حاضری تھی، اس مجلس کے ملفوظات مولانا موصوف نے حضرت کے وصال سے صرف ہفتہ عشرہ پہلے الفرقان میں اشاعت کے لیے دیے تھے، چنانچہ وہ اسی شمارہ میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس کے آخری ملفوظ میں بھی پوری صراحت کے ساتھ حضرت نے اپنے بارے میں یہی اطلاع دی تھی اور بھی مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس آخری دور میں اس احساس و یقین کا اتنا غلبہ تھا کہ قریب قریب ہر مجلس میں اس کا اظہار فرماتے تھے۔

مولانا محمد عمران خاں صاحب نے بتایا کہ قریباً دو مہینے پہلے حضرت کی طبیعت چند روز کچھ ناساز رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں پر کچھ ورم ہو گیا تھا۔ جو علاج سے جاتا رہا تھا لیکن اس کے بعد سے جسمانی ضعف بہت بڑھ گیا تھا، سہارے کے بغیر اٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے، مگر نماز بالکل اسی طرح پڑھتے تھے جس طرح ہمیشہ پڑھا کرتے تھے، دیکھنے والے کو اس میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا۔ البتہ مسجد تشریف نہیں لے جا سکتے تھے۔ گھر ہی پر جماعت ہوتی تھی۔ اس شدید ضعف کے زمانے میں بھی معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا، بے خوابی کی شکایت ہو گئی تھی اس لیے رات کو نیند بہت دیر سے آتی تھی، لیکن ہمیشہ کے معمول کے مطابق تہجد کے لیے اپنے وقت پر اٹھ جاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جو وقت سونے کا ہے اس وقت تو نیند نہیں آتی۔ اور جو وقت سونے کا نہیں جاگنے کا ہے اس وقت آتی ہے، تو میں اس کو پاس نہیں آنے دیتا۔

روزانہ کا معمول تھا کہ فجر کے بعد اشراق تک مصلے ہی پر اذکار و اوراد میں مشغول رہتے۔ اشراق پڑھ کے خانقاہ تشریف لے آتے اور کسی کو ساتھ بٹھا کے پہلے قرآن مجید کے ۴۔۵ پارے سناتے، سننے والے صاحب اگر حافظ ہوتے تب بھی حضرت کے حکم کے مطابق قرآن مجید میں دیکھ کے سنتے اس کے بعد گویا مجلس شروع ہو جاتی۔ سب سے پہلے ایک دو رکوع کے بقدر قرآن مجید تلاوت فرما کر اس کا ترجمہ سناتے۔ اس کے لیے مولانا فتح محمد صاحب جالندھری مرحوم کا ترجمہ سامنے رہتا اسی سے پڑھ کر سناتے۔ اس کے بعد کسی اردو تفسیر سے (اکثر احسن التفاسیر سے جو اردو کی بہت اچھی تفسیروں میں سے ہے) کچھ پڑھ کر سناتے اور اس ترجمہ اور تفسیر کے سلسلہ میں جو کچھ ذہن پر وارد ہوتا اس کو درمیان میں فرماتے جاتے۔ اس کے بعد حدیث کی کتاب (زیادہ تر مشکوٰۃ شریف) سے کوئی دوسرے صاحب پہلے حدیث کا عربی متن پڑھتے اور حضرت کتاب ہی سے اس کا ترجمہ خود پڑھ کر سناتے۔ اس سب کے بعد امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں سے کوئی مکتوب پڑھ کر سناتے اور کوئی دوسرے صاحب

مکتوبات کے مطبوعہ اردو ترجمہ سے اس کا ترجمہ پڑھ کر سُناتے اور حضرت کو جو کچھ فرمانا ہوتا فرماتے ـــــ پھر حاضرین مجلس کے احوال اور ان کی سطح کا لحاظ فرماتے ہوئے اُس طرح کے حقائق و معارف بیان فرماتے جس کا نمونہ "یک دو ساعت صحبتے با اہل دل" کے زیر عنوان مولانا علی میاں کے مرتب کردہ ملفوظات میں ناظرین الفرقان پڑھتے رہے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس کی آخری قسط زیر نظر شمارہ ہی میں شائع ہو رہی ہے۔

یہ سب روزمرہ کا معمول تھا اور بس یہی حضرت کی مجلس تھی۔ اکثر ۱۰-۱۱ بجے یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا۔ اتوار کے دن حاضرین کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی تھی، اس آخری دور میں چار چار سو اور پانچ پانچ سو تک ہو جاتی تھی۔ اُس دن ارشادات کا سلسلہ بہت طویل ہو جاتا اور مجلس کبھی کبھی بارہ بجے کے بعد ختم ہوتی۔

آخری اتوار (۱۴ رمئی ۲۰۰۰ء) کو مجلس اور زیادہ طویل ہوئی اور اُس دن بار بار اس کا اظہار فرمایا کہ میرا وقت بالکل قریب آگیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک خاص والہانہ کیفیت کے ساتھ عارف رومی کے یہ اشعار بھی پڑھے ؎

واصل درگاہ آں بیچوں شوم	ایں چہ خوش باشد کہ سوئے شہ روم
بائے کو بال سوئے بام او رسی	وقت آمد کز جہان بیکسی

اس کے بعد پیر اور منگل کو بھی بالکل اپنے معمول کے مطابق مجلس ہوئی ـــ بدھ کے دن بھی (جو حضرت کے وصال کا دن ہے) روزمرہ کی طرح مجلس ہوئی بلکہ اُس دن صبح کو قرآن مجید روزمرہ کے معمول سے بہت زیادہ قریباً دوگنا سنایا۔ دوسرے معمولات ترجمۂ قرآن، تفسیر و حدیث شریف میں بھی کچھ زیادتی رہی۔ اور حضرت گیارہ بجے کے بعد خانقاہ سے اُٹھ کر اندر تشریف لے گئے۔ بہت خفیف سا کھانا تناول فرمایا۔

گھر میں ایک الماری ہے جس میں حضرت اپنی کچھ خاص پسندیدہ چیزیں محفوظ رکھتے تھے اور وہ ہمیشہ بند رہتی تھی۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی صاحبہ کو بلایا اور وہ الماری کھلوائی اُن سے فرمایا جو چیزیں تم ان میں سے لینا چاہو لے لو۔ انھوں نے کچھ چیزیں نکال لیں اور معمول کے مطابق الماری کو بند کرنا چاہا تو فرمایا اب اس کو بند نہ کرو کھلی رہنے دو۔

پھر صاحبزادے سعید میاں اور میاں مصباح الحسن سے کچھ باتیں فرماتے رہے۔ پھر قیلولہ کی نیت سے لیٹ گئے۔ دو ڈھائی بجے کے قریب اُٹھ کر ظہر کی نماز ادا فرمائی اور پھر لیٹ گئے ـــ یہاں تک کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی ـــ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا طبیعت پر گھبراہٹ ہے پھر اُٹھ کر غسل خانہ تشریف لے گئے۔ وہاں چکر آگیا، چھوٹی صاحبزادی کو احساس ہو گیا، وہ اور ان کی والدہ پہونچیں وہاں سے اٹھا کر لایا گیا اور لٹا دیا گیا۔ اس وقت غشی کی سی کیفیت تھی۔ قریبی مسجد میں عرض آگیا۔ ڈاکٹر قریشی صاحب کو بلایا گیا تھا وہ فوراً پہونچ گئے۔ حضرت نے اُن سے فرمایا کچھ نہیں

بس چکر آگیا تھا۔ اس کے بعد کچھ پڑھنے میں مشغول ہوگئے لیکن سُنا نہیں جاسکا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ بڑے صاحبزادے صاحب نے صرف یہ آیت سُنی وَكَاَيِّنْ مِنْ دَابَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۔۔۔۔۔ الآیۃ۔ اسی حالت میں پیٹ میں یا سینہ میں تکلیف شروع ہوئی۔ شدتِ کرب کی وجہ سے بار بار اٹھانے کو اور لٹانے کو فرماتے۔ ڈاکٹر قریشی صاحب نے انجکشن تیار کیا اور عرض کیا کہ اسے لگوا لیجیے، انشاء اللہ ابھی سکون ہو جائے گا۔ فرمایا کہ اچھا لگا دیجیے۔ اور پھر کچھ پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ صاحبزادگان اور صاحبزادیاں اور اہلیہ محترمہ قریب تھیں، فرمایا کہ تم سب کلمہ شریف پڑھو، کلمۂ شہادت پڑھو، یٰسین شریف پڑھو، بڑے صاحبزادے محمد سعید صاحب نے یٰسین شریف شروع کر دی۔ دوسرے حضرات کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پڑھنے لگے، فرمایا اب میں رخصت ہو رہا ہوں گھٹنوں تک جان نکل چکی ہے۔ پھر کچھ پڑھنے میں مشغول ہوگئے جو سُنا نہیں جاسکا، تھوڑی دیر کے بعد فرمایا اب ہاتھوں کی جان نکل چکی ہے۔ پھر موجودین کو مخاطب کر کے فرمایا تم سب گواہ رہنا اور پھر بلند آواز سے ایک دفعہ کلمۂ شہادت پڑھا۔ پھر تقریباً ایک منٹ کے بعد بلند آواز سے فرمایا السلام علیکم اور روح واصل بحق ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

بڑی صاحبزادی صاحبہ ناگپور میں تھیں اُن کو ٹیلیفون سے اطلاع دی گئی، وہ اُسی وقت کھوپال کے لیے روانہ ہوگئیں۔ اُن کے انتظار کی وجہ سے تدفین میں تاخیر کی گئی۔ اور جمعرات کے دن ۲ بجے سہ پہر جنازہ خانقاہ سے اُٹھ سکا۔ جنازہ میں شریک ہونے والوں کا اندازہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک کیا گیا ہے جنازہ کی نماز صاحبزادگان کے اصرار سے مولانا محمد عمران خاں صاحب نے پڑھائی اور عصر و مغرب کے درمیان تدفین عمل میں آئی۔

اس حادثہ سے حضرت کے اعزہ و متعلقین اور محبین و مسترشدین کا متاثر اور غمزدہ ہونا بالکل فطری بات ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ حضرت تو اپنی مراد کو پہنچ گئے جس کے لیے روح عرصہ سے مشتاق اور بے چین تھی ــــ حضرت کا ایک ملفوظ جو الفرقان میں اب سے بہت پہلے شائع ہوا تھا، اس کا اقتباس آج پھر پڑھ لیا جائے۔

ایک سلسلۂ کلام میں "حیاتِ طیبہ" اور دُنیا و آخرت کی زندگی کی حقیقت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"مجھے تعجب ہوتا ہے جب کوئی بڑھاپے کی شکایت کرتا اور بڑے درد و حسرت سے کہتا ہے کہ اب مرنا ہی باقی ہے، وہ لڑکوں اور جوانوں کو رشک و حسرت سے دیکھتا ہے کہ کبھی میں بھی ایسا ہی تھا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی کسان خوشی خوشی کھیتی کرے جب غلہ کاٹنے کا وقت آئے تو رنجیدہ اور

مایوس ہو، حالانکہ یہ ساری محنت و مشقت اسی دن کے لیے تھی...... حدیث میں آیا ہے کہ جو اللہ کی ملاقات کا شائق ہو اللہ بھی اس کی ملاقات کا مشتاق ہوتا ہے "مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَائَہٗ" ـــ حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بندے کے لیے خدا کی طرف سے سلام و پیام آتا ہے۔"

اسی سلسلۂ کلام میں پنجرہ میں بند ایک مینا کا یہ حال بیان فرما کر کہ وہ اُڑنے والی میناؤں کی آواز سن کر پنجرہ میں بڑی بیتابی سے پھڑپھڑایا کرتی تھی ـــ فرمایا کہ

"یہی حالت رُوح کی ہے جب وہ اوپر کی آوازیں سنتی ہے اور اس کے کان میں صدا آتی ہے "یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربك راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی" تو وہ بھی پھڑپھڑاتی ہے اور اس کا دل بھی چاہتا ہے کہ پنجرہ کی تیلیاں توڑ کر وہ بھی اپنے آشیانے کی طرف پرواز کرے اور اپنے ہم جنسوں سے جا ملے۔"

(صحبتے با اہل دل یعنی ملفوظات حضرت شاہ محمد یعقوبؒ ص۶۸-۶۹ (زیر طبع)

ایک دوسرے ملفوظ میں مومن کی موت کی یہ حقیقت بیان کرتے ہوئے کہ وہ دراصل وطن اصلی عالمِ آخرت اور اللہ تعالیٰ کے مقام قرب و رضا کی طرف منتقلی کا نام ہے ـــ ارشاد فرمایا۔

"میں تو جب کسی بندۂ خدا کے متعلق سنتا ہوں کہ وہ کلمہ پڑھتے ہوئے ایمان کے ساتھ دنیا سے گیا تو میرا مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ اس کے گھر مٹھائی بھیجوں۔"

(صحبتے با اہل دل ص۹ (زیر طبع)

ہم ـــ حضرت کے صاحبزادگان، صاحبزادیوں اور اہلیہ محترمہ اور تمام محبین و مسترشدین کی خدمت میں حضرت کے یہی دو ملفوظ ـــ بطور تعزیت پیش کرتے ہیں ـــ اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازے، درجے بلند فرمائے اور اخلاف کو اُن کی اصل دولت کا وارث بنائے۔

انہ غفور رحیم شکور

محمد منظور نعمانی

حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جو دھپوری

(جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

اب سے ٹھیک دس سال پہلے الفرقان کی جون اور جولائی ۱۹۶۰ء کی دو اشاعتوں میں اس ناچیز نے ایک مضمون بعنوان ــــ اللہ کا ایک بندہ ــــ حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جودھپوری کے متعلق لکھا تھا، خوب یاد ہے کہ اُس وقت اُس کا خاص محرک یہ ہوا تھا کہ قریباً ۲۵ سالہ ربط و تعلق کی وجہ سے میں حضرت ممدوح کی نہایت سبق آموز اور عبرت انگیز زندگی اور غیر معمولی بلکہ محیر العقول حالات سے خاصا واقف اور بہت زیادہ متاثر تھا اور اُن کے وجود کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی اور اسلام کا معجزہ سمجھتا تھا۔ اسی کے ساتھ میں محسوس کرتا تھا کہ اُن کو بہت سے وہ لوگ نہیں جانتے جو اگر جان لیں تو بہت فائدہ اٹھائیں اور بہت کچھ حاصل کرلیں۔

حضرت حاجی صاحب کی عمر اُس وقت اسّی سے متجاوز ہو چکی تھی، خلقی اور جسمانی حیثیت سے بہت لاغر و نحیف اور بظاہر بہت ضعیف سے تھے اس لیے قیاس اور اندازہ یہ تھا کہ دنیا سے ان کی رخصتی کا وقت اب زیادہ دور نہ ہوگا، اسی بنا پر دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان بڑے میاں کے چلے جانے کے بعد ان کے حالات لکھے گئے تو بہتوں کو بڑی حسرت ہوگی کہ ہمارے زمانہ میں اللہ کا ایک ایسا بندہ موجود تھا اور ہمیں خبر نہ تھی اگر پتہ ہوتا تو ان کی برکات سے متمتع ہوتے ــــ الغرض اسی خیال اور نیت سے اُس وقت میں نے وہ حالات الفرقان میں لکھے تھے۔

بہت سے لوگوں کو اُس مضمون ہی سے حضرت کا پتہ لگا، بعض اصحاب توفیق نے اُسے پڑھ کے حضرت کی خدمت میں حاضری اور زیارت و استفادہ کے لیے جودھپور کا سفر کیا، بعضوں نے خط و کتابت

سے رابطہ قائم کیا ـــــ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اُس کے بعد بھی پورے دس سال تک حضرت ممدوح کو اس دنیا میں رکھا ـــــ ادھر کافی عرصہ سے خطوط سے اطلاع مل رہی تھی کہ ضعف بہت بڑھا ہوا ہے۔ یہ ناچیز حاضری کا ارادہ بھی کر رہا تھا کہ ۲۸ جولائی کی شام کو حضرت کے صاحبزادگان کی طرف سے لکھا ہوا خط ملا کہ ۲۳ اور ۲۴ جولائی کی درمیانی رات میں تین بجکر پچیس منٹ پر حضرت کا وصال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَعَافِہٖ وَاعْفُ عَنْہُ وَاَکْرِمْ نُزُلَہٗ وَاجْعَلِ الْجَنَّۃَ مَثْوَاہُ

اس گنہگار بندہ پر اُس کے رب کریم کے بے حد و حساب احسانات ہیں سے ایک عظیم احسان یہ بھی ہے کہ اس تھوڑی سی زندگی میں اُس نے بہت سے مقبول بندوں تک پہنچایا، اپنے دل کو ان کی محبت و عظمت اور بغیر کسی استحقاق کے ان کی نظر عنایت و شفقت نصیب ہوئی ـــــ لیکن حضرت حاجی عبد الغفور صاحب کو صرف ایک باخدا بزرگ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اُس کی صفتِ ہدایت و رحمت کا ایک معجزہ جاننا۔ ـــــ وہ ایک نہایت غریب تیلی گھرانے میں پیدا ہوئے، جہاں نہ دنیا تھی نہ دین، انتہائی غربت کی وجہ سے بالکل بچپنے ہی سے محنت مزدوری شروع کی، بیلیں، بھینسوں کا گوبر بینا، گیارہ سال کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے ـــــ پھر اس محنت مزدوری ہی کے زمانہ میں اور اسی کو وسیلہ بنا کر رحمت خداوندی نے دل میں ایسا دینی رجحان پیدا کیا کہ پیسے بچا بچا کر اچھی دینی اصلاحی کتابیں منگواتے اور چونکہ خود پڑھے لکھے نہیں تھے اس لیے دوسروں کی خوشامد کر کے اُن سے پڑھوا کے سُنتے، پھر اپنے ہی طور پر محنت کر کے اتنی حرف شناسی بھی حاصل کر لی کہ وہ کتابیں خود پڑھنے لگے ـــ اسی دور میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینی و دنیوی برکات و ترقیات کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ شروع ہوا دُنیا میں تو ۴-۵ پیسے پانے والے ایک غریب مزدور سے ترقی کر کے بڑے اور بہت بڑے ٹھیکیدار ہو گئے، اس راستہ سے اللہ تعالیٰ نے لاکھوں عطا فرمائے اور لاکھوں ہی اپنے ہاتھوں سے اُن راہوں میں خرچ کیے جن میں خرچ کرنا کارِ ثواب، اپنی آخرت کے لیے بہتر اور اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کا وسیلہ تھا ـــــ اور اسی کے ساتھ دینی و روحانی ترقی اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہوتی رہی یہاں تک کہ حضرت حکیم الامتؒ کی طرف سے مجاز ہوئے ـــ اب سے کوئی ۲۵-۳۰ سال پہلے قلب میں شدت سے یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو سرمایہ جائداد وغیرہ دی ہے وہ سب آئندہ وارث ہونے والے اصحاب حقوق کو دے کے یا راہ خدا میں صرف کر کے

بالکل اس طرح خالی ہاتھ ہو جاؤں جس طرح ماں کے پیٹ سے پیدا کیا گیا تھا کہ کچھ بھی ملکیت میں نہ تھا اور آئندہ زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے مطابق مسکین والی گزاروں اور اسی حال میں اس دنیا سے اپنے رب کے پاس جاؤں (اللھم احینی مسکیناً وامتنی مسکیناً واحشرنی فی زمرۃ المساکین) چنانچہ ایسا ہی کیا اور سب کچھ اپنی ملکیت سے نکال کے بالکل فقیر بے نوا ہو گئے اور اپنی بنائی ہوئی مسجد کے ایک چھوٹے سے حجرہ میں رہائش اختیار فرمائی ـــــ دین کی روح اور ایمان کا نقطۂ کمال اخلاص و احسان ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا صحیح علم در اصل علیمٌ بذات الصدور ہی کو ہوتا ہے لیکن جس حد تک کوئی بشر کسی بندہ کے بارے میں اپنے ادراک و احساس اور اندازہ کی بنا پر کچھ کہہ سکتا ہے یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے قریب رہ کے گویا آنکھوں سے نظر آتا تھا کہ اُن کا اُٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا پینا، لینا دینا حتیٰ کہ ہنسنا بولنا اور خاموش رہنا بھی اللہ کے لیے اور حضرت اللہ کے لیے ہے۔

ابھی اوپر عرض کیا ہے کہ لکھے پڑھے بالکل نہیں تھے، جب اللہ نے دینی ذوق نصیب فرمایا تو اتنی حرف شناسی سیکھ لی تھی کہ اردو کی دینی کتابیں کسی طرح پڑھ لیتے تھے۔ گفتگو میں بعض الفاظ بھی صحیح ادا نہیں ہوتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب کو حکمت اور تفقہ کی وہ دولت عطا ہوئی تھی کہ ہم جیسے کتاب خواں بھی حضرت کی باتوں سے علم حاصل کرتے تھے، کم از کم اس عاجز نے عارف رومی کے اس شعر کا کوئی مصداق اور نمونہ اُن جیسا دوسرا نہیں دیکھا۔

بینی اندر خود علوم انبیا ــــ بے کتاب و بے معید و اوستا

یہ سب چیزیں تفصیل سے اُس مضمون میں لکھی جا چکی ہیں جو الفرقان میں اب سے دس سال پہلے لکھا گیا تھا۔

حضرت مرحوم ایک وسیع علاقہ کے لیے بجائے خود ایک دینی مرکز اور مینارۂ ہدایت تھے، اب وہ اس دنیا سے اٹھا لیے گئے، اللہ تعالیٰ حضرت کے صاحبزادوں کو اور اس علاقہ کے اُن سب حضرات کو جنھوں نے حضرت کی صحبت و تربیت سے تعلق مع اللہ اور فکر آخرت کی دولت پائی، توفیق دے کہ وہ حضرت کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے خدمت دین اور خیر کے اُن سب کاموں اور سلسلوں کے باقی اور جاری رہنے کا ذریعہ بنیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حضرت مرحوم کو وسیلہ بنایا تھا ـــــ یہی ان پر حضرت کا خاص حق ہے اور یہی اُن کے لیے دینی و ایمانی ترقی اور کامیابی کی خاص راہ ہے۔

محمد منظور نعمانی

رفیقۂ حیات کے انتقال پر

(رمضان و شوال ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

اِنَّا بِفِرَاقِكِ لَمَحْزُوْنُوْنَ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يُرْضِيْ رَبَّنَا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ؀

میرے خانگی حادثہ پر بزرگوں مخلص دوستوں اور عزیزوں کے تعزیتی خطوط کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ان میں سے بعض نے جو بہت ہی دردمندی سے لکھے گئے ہیں، دل میں داعیہ پیدا کیا کہ مرحومہ اہلیہ کے متعلق چند باتیں حوالۂ قلم کروں۔ جن کے بارے میں اُمید ہے کہ ان شاء اللہ ان سے واقفیت اللہ کے بہت سے بندوں اور بندیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن اور اس کے کرم پر اعتماد و یقین میں اضافہ کا ذریعہ اور خود مرحومہ کے لیے بھی ان شاء اللہ خیر و رحمت کا وسیلہ بنیں گی۔

مرحومہ رفیقۂ حیات کی حیثیت سے قریباً ۲۰ سال میرے ساتھ رہیں، اس پوری مدت میں برابر یہ تجربہ رہا کہ اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ خاص فضل کا ہے، اس کا بہت ہی نمایاں اور ایک درجہ میں محیر العقول ظہور اُن کے سفرِ حج اور سفرِ آخرت کے بعض واقعات میں ہوا۔ اس وقت اسی سلسلہ کے چند واقعات سپردِ قلم کرتا ہوں۔

وہ میرے والد ماجد مرحوم کی حقیقی بھانجی کی لڑکی تھیں، دیندار اور عبادت گزار اپنے بچپن سے تھیں، میرے گھر آنے سے بہت پہلے اپنی ابتدائی عمر ہی میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے بیعت ہوئی تھیں، پھر حضرت کے وصال کے بعد خود میرے ساتھ سہارنپور حاضر ہو کر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم سے بیعت کی تجدید کی تھی۔

قدرتی طور پر ان کی بڑی آرزو اور تمنا تھی کہ ان کو حج کی سعادت نصیب ہو لیکن اس کا سامان نہ ان کے پاس تھا نہ میرے پاس۔ اور وہ اس لحاظ سے میرا حال اچھی طرح جانتی تھیں اس لیے اس سلسلہ میں کبھی انھوں نے مجھ سے ایک حرف بھی نہیں کہا ــــــ مگر میرے لیے اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے کئی بار اس کا سامان فراہم کیا اور پھر ادھر چند برسوں سے "رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ)" کی رکنیت کے طفیل قریباً ہر سال حرمین پاک کی حاضری نصیب ہونے لگی تو میرے جانے کے وقت ان کے دل کا جو حال ہوتا تھا اس کو میں محسوس کرتا تھا لیکن وہ مجھ سے اس سلسلہ میں کبھی کچھ نہ کہتیں، بس اللہ تعالیٰ سے عرض کرتیں ــــــ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کی بالکل آخری مہلت میں یعنی ان کے مرض الموت کے شروع ہونے سے صرف چند ہفتے پہلے بے وہم و گمان بالکل "لا یحتسبی" طور پر ان کے اور میرے دونوں کے ہوائی سفر کا ایسے عجیب و غریب طریقے سے انتظام فرمایا کہ اس کی کوئی توجیہہ رب کریم کے خاص الخاص فضل کے سوا نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد مرحلہ یہ تھا کہ ہم دونوں کے لیے حج والے پاسپورٹ سے سفر کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ انٹرنیشنل پاسپورٹ ہی سے سفر کر سکتے تھے۔ اور اہلیہ کے لیے انٹرنیشنل پاسپورٹ حاصل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اندیشہ بلکہ گمان یہی تھا کہ پاسپورٹ جلدی نہ مل سکے گا، اور وقت میں گنجائش بالکل نہیں تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی کارسازی کہ حیرت انگیز طریقہ پر صرف ۳-۴ دن میں ان کا پاسپورٹ تیار ہوا اور مل گیا۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ انٹرنیشنل پاسپورٹ سے سفر کرنے والوں کو صرف ۵۶ روپے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے جو ہم جیسوں کے لیے جدہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے سے مکہ مکرمہ پہنچنے تک کے لیے بھی مشکل ہی سے کافی ہو سکتے تھے۔ اس مسئلہ نے اچھا خاصا تردد پیدا کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے رہنمائی فرمائی اور ہم نے اپنے دل سے کہا کہ اس سفر کا انتظام رب کریم نے محض اپنے لطف و کرم سے فرمایا ہے اس لیے بس اسی کے لطف و کرم پر بھروسہ کر کے چلنا چاہیے چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اور پھر پورے سفر میں اس کا بے حساب لطف و کرم شامل حال رہا۔ اور ہاتھ بالکل خالی ہونے کے باوجود وہ راحتیں اور سہولتیں نصیب رہیں جو کبھی کسی سفر میں میسر نہ ہوئی

تھیں اور جن کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بالکل ایسا معاملہ رہا گویا گھر سے قدم نکالتے ہی کسی کریم میزبان نے اپنی مہمانی میں لے لیا ہے۔

حج کے مسافروں کی پہلی منزل بمبئی ہوتی ہے۔ وہاں ہم جیسے لوگوں کے لیے قیام کی اچھی سے اچھی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی مخلص دوست اپنا مہمان بنالیں اور خود تکلیف اٹھا کے اپنے گھر کے کسی حصہ میں ٹھہرالیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم نے اس سفر میں اس سے بہت زیادہ آرام دہ انتظام کا فرمایا کہ ہمارے نہایت مخلص دوست حاجی احمد صاحب (زمزمی) نے ہمیشہ کے معمول کے مطابق مہمان تو اپنا بنایا لیکن اپنے گھر میں قیام کی دلی خواہش کے باوجود خاص کر اہلیہ کی راحت کے خیال سے اپنی خوشدامن صاحبہ کے وسیع مکان میں قیام کرایا، جو خود اس وقت حج پر گئی ہوئی تھیں اور اپنا وہ مکان پورے ساز و سامان کے ساتھ حاجی صاحب موصوف ہی کے سپرد کر گئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بمبئی میں قیام کے ایسے آرام دہ انتظام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلاشبہ یہ محض فضل ربی تھا۔ پھر بمبئی کے احباب و مخلصین کے گھروں کی خواتین نے ان کی آمد کو گویا ایک تقریب بنالیا اور ان کے ساتھ انتہائی خلوص و محبت اور اکرام کا معاملہ کیا۔ پھر جدہ پہنچنے پر مخلص مکرم الحاج محمد ولی عبداللہ نور ولی اور ان کے اہل خانہ نے ایسی ہی میزبانی کی۔ بلاشبہ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم اور اسی کی طرف سے تھا۔

میں نے مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ میں قیام کرنا طے کیا تھا، مجھے معلوم تھا کہ ایام حج میں ہندوستان و پاکستان کے سینکڑوں حجاج جن میں خواص کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے مدرسہ صولتیہ میں قیام کرتے ہیں، اس لیے سوچ لیا تھا کہ بس گزارے کی جگہ پر قناعت کرنا ہوگا اور اس مجاہدہ کے لیے دل پوری طرح بلکہ خوشی کے ساتھ آمادہ و مطمئن تھا۔ لیکن جب ہم لوگ مدرسہ پر جاکر اترے تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کے خاص دفتر کے اوپر جو ایک صحن دار اور ہم جیسوں کے لیے نہایت آرام دہ کمرہ حال ہی میں بن کر تیار ہوا ہے، ہمارے عنایت فرما حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب نے (جو مدرسہ کے سربراہ ہیں) وہ ہمارے لیے مخصوص کر رکھا ہے، فوراً ہمارا سامان وہیں پہنچوا دیا گیا۔ خود ہم پہنچے تو دیکھا کہ اس کمرہ میں رہائش ہی کے نہیں بلکہ آسائش کے بھی ضروری سامان ہمارے لیے پہلے سے فراہم کر دیے گئے ہیں۔ پلنگ بچھے ہوئے ہیں، ان پر ہمارے لیے بستر بھی لگے ہوئے ہیں۔ الغرض

وہ سب کچھ تھا جو راحت کے لیے ضروری تھا اور جس کا پہلے سے وہم وگمان نہیں تھا ——— ہم دونوں اپنا سامان کمرہ میں رکھنے کے بعد عمرہ ادا کرنے کے لیے حرم شریف جانے لگے، مرحومہ اہلیہ میرے پیچھے پیچھے تھیں۔ حضرت مولانا شیخ محمد سلیم صاحب کے پاس سے گزر ہوا تو میں نے اُن کی اس غیر معمولی عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے دلی احساس و تاثر کا اظہار کیا تو مولانا نے حسب عادت بڑی صفائی کے ساتھ فرمایا، مولانا! سچی بات یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے۔ آپ کے لیے اور آپ کی خاطر بالکل نہیں ہوا، آپ تو آتے ہی رہتے ہیں، بلکہ ان کے لیے کیا گیا ہے جو آپ کے ساتھ آئی ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ کبھی پھر آئیں گی یا نہیں۔

ایک نہایت مخلص دوست قاری محمد سلیمان صاحب نے (جو اصلاً سورتی ہیں لیکن مکہ معظمہ میں مقیم ہیں) مولانا شیخ محمد سلیم صاحب سے اجازت لے کر ہم دونوں کو اپنا مستقل مہمان بنا لیا اور سوائے ان دنوں کے جب کہیں خصوصی دعوت ہوتی روزانہ ممدوح کے یہاں سے کھانے کا خوان ہمارے کمرہ میں آتا رہا۔ اسی طرح مدینہ طیبہ کے پورے زمانۂ قیام میں ایک دوسرے نہایت عزیز دوست صوفی محمد اقبال صاحب نے ہم دونوں کی میزبانی کی۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اس پورے سفر میں وہ سہولتیں بلا استحقاق نصیب فرمائیں جو اس سے پہلے کسی سفر میں نصیب نہیں ہوئی تھیں اور جن کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔

ان سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ اگرچہ مرحومہ کی عمر سفر حج کے وقت پچاس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی لیکن وہ فطری طور پر بہت کمزور تھیں اور کئی برس پہلے سے اُن کے ضعف جسمانی اور ناتوانی کا حال یہ تھا کہ اگر ان کو سو دو سو قدم بھی پیدل چلنا پڑ جاتا تو اختلاج کی سی کیفیت ہو جاتی اور سانس کا نظام بگڑ جاتا اور بہت دیر تک آرام کرنے کے بعد حالت درست ہو پاتی اور کبھی کبھی دوا استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ یہ بیچاری حج اور عمرہ کے سلسلہ کے طواف بھی بہ مشکل کر سکیں گی اور صفا و مروہ کے درمیان سعی تو سواری ہی سے کر سکیں گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے فضل خاص کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ مکہ معظمہ پہونچتے ہی اُن میں وہ توانائی آگئی جو شاید کبھی جوانی میں رہی ہو۔

جدہ سے بذریعہ کار روانہ ہو کے ہم لوگ مدرسہ صولتیہ پہونچے تھے، سامان اپنے کمرہ میں محفوظ کر کے وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر عمرہ ادا کرنے کے لیے حرم شریف کو چلے، مدرسہ سے حرم شریف کا فاصلہ

قریباً ۳ فرلانگ ہے، میں نے مدرسہ سے باہر سڑک پر آکر اُن کی وجہ سے ٹیکسی کرنی چاہی، انھوں نے کہا کہ ہم پیدل ہی چلیں گے، لیکن چونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ نہیں چل سکیں گی اس لیے میں نے اُن کی بات نہیں مانی اور ٹیکسی سے ہم دونوں حرم شریف گئے، وہاں پہونچ کر پہلے طواف کیا، طواف کے بعد ہم سعی کے لیے صفا پر آئے، وہاں وہ ہاتھ گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں جن پر وہ بیچارے ضعیف اور معذور لوگ کرایہ ادا کر کے سعی کرتے ہیں جو پیدل چل کر نہیں کر سکتے ــــ میں نے اہلیہ سے کہا کہ تم گاڑی سے سعی کرلو، انھوں نے کہا کہ نہیں میں پیدل ہی کروں گی! میں نے بھی اللہ تعالیٰ کا فضل دیکھ کے طواف کے سات چکروں کا اور پھر مطاف سے صفا تک آنے کا اُن پر ذرا بھی اثر نہیں پڑا، یہی مناسب سمجھا کہ وہ اگر کر سکیں تو میرے ساتھ پیدل ہی سعی کرلیں، چنانچہ انھوں نے پوری سعی میرے ساتھ پیدل کی، اور اُن پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا، حالانکہ سعی کے سات پھیروں کی مسافت پونے دو میل کے قریب ہو جاتی ہے، پھر اس کے بعد وہ میرے ساتھ پیدل ہی مدرسہ صولتیہ واپس ہوئیں۔ پہلے دن کے اس تجربے کے بعد مجھے احساس ہو گیا کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ پھر تو مکہ معظمہ کے پورے زمانۂ قیام میں یہ معمول رہا کہ وہ اکثر پانچوں وقت کی نماز کے لیے میرے ساتھ پیدل حرم شریف آتیں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بالکل تندرست خواتین کی طرح بکثرت نفلی طواف بھی کرتیں۔

مدینہ طیبہ میں ہمارا قیام عزیز محترم صوفی محمد اقبال صاحب کے پاس باب المجیدی میں تھا، وہاں سے مسجد نبوی کا فاصلہ بھی قریب قریب اتنا ہی ہے جتنا کہ مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ سے حرم شریف کا فاصلہ ہے، وہاں بھی وہ نمازوں کے اکثر اوقات میں میرے ساتھ پیدل ہی مسجد آتیں، ہم دونوں بار بار اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کو یاد کرتے اور اس کا شکر ادا کرتے۔

مجموعی طور پر قریباً چالیس دن حرمین پاک میں قیام رہا۔ انھیں ایک دن بھی اُس ضعف و ناتوانی کا احساس نہیں ہوا جو برسوں سے لازمۂ زندگی بنا ہوا تھا، بمبئی واپسی تک یہی حال رہا، البتہ بمبئی سے لکھنؤ آتے ہوئے ٹرین ہی میں محسوس ہوا کہ اس کیفیت میں کمی آرہی ہے، پھر گھر پہنچنے کے چند ہی روز بعد وہ اپنے پچھلے حال پر واپس آگئیں اور معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح غیر معمولی طور پر اپنے خاص الخاص فضل سے اُن کے سفر کا سامان فراہم کر کے ان کی ایک بڑی آرزو اور تمنا پوری کی تھی اسی طرح خارق عادت طور پر ان کو صرف سفر حج کے لیے یہ طاقت اور توانائی بخش دی گئی تھی۔

پھر چند ہی روز کے بعد اُن کے اُس مرض کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کو ان کی زندگی کے خاتمہ کا ذریعہ بننا تھا ——— اور ۲۶ شعبان کو ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سفرِ حج دراصل اُن کے سفرِ آخرت کی تمہید اور اس کی تیاری کا ذریعہ و وسیلہ تھا ——— اللہ تعالیٰ کے جس فضل و کرم کا تجربہ ان کی زندگی میں اور خاص کر اُن کے سفرِ حج میں ہوا، اُس ربِ کریم سے پوری اُمید ہے کہ سفرِ آخرت کی ساری منزلوں میں بھی اللہ تعالیٰ کا وہی فضل و کرم مرحومہ کو نصیب رہے گا۔ انہ رؤف رحیم۔

مرحومہ کے انتقال اور مفارقت کا طبعی صدمہ تو فطری بات ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو حسنِ ظن اور اس کی شانِ کرم پر جو اعتماد نصیب ہے اُس کی بنا پر الحمد للہ دل کو یہ اطمینان ہے کہ اِس وقت اُن کا اس دنیا سے چلا جانا ہی اُن کے لیے بہتر ہوا۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے (جب اُن کی طبیعت ناساز تھی) فرمایا تھا لو كان وانا حیّ فاستغفر اللہ وأدعو لك (یعنی اے عائشہ! اگر تمہارا انتقال میری زندگی میں ہوگیا تو میں تمہارے واسطے اللہ سے خوب مغفرت طلب کروں گا اور دعائیں کروں گا) ———

اس حدیث پاک کے اشارہ کے مطابق مرحومہ اہلیہ کے لیے استغفار اور دعا کے اہتمام کی توفیق الحمد للہ اس عاجز کو نصیب ہے۔ اور چونکہ اہل دین کی ایک وسیع برادری سے تعلق ہے اور اللہ والوں سے محبت ہے اس لیے اپنے حلقۂ تعلق و تعارف میں جہاں جہاں بھی ان کے انتقال کی اطلاع ہوئی، اللہ کے مخلص اور صالح بندوں نے اہتمام سے ان کے لیے استغفار فرمایا اور ایصالِ ثواب کیا۔ جو سیکڑوں خطوط اس سلسلہ میں اب تک مل چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھیں پڑھ کر خود مجھے مرحومہ پر رشک آتا ہے۔ اہلِ دین اور اللہ والوں سے تعلق کی تنہا یہی کتنی بڑی برکت ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر و قیمت سمجھنے کی توفیق دے۔ اگر میرے پاس ساری دنیا کے خزانے ہوتے تو میں ان کو صرف کرکے بھی مرحومہ کے لیے اتنی دعا و استغفار اور اتنا ایصالِ ثواب نہ کرا سکتا۔ یہ محض علمی و دینی تعلق کی برکت ہے کہ اللہ کے بے شمار بندوں نے حرمین پاک تک میں ان کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کیں اور ایصالِ ثواب کیا۔ مکہ معظمہ سے ایک مخلص عزیز کا خط ملا ہے کہ ان کو جب اس حادثہ کی خبر ملی تو انھوں نے مرحومہ کی طرف سے عمرہ بھی کیا، اور حدیث شریف میں ہے کہ رمضان مبارک میں عمرہ حج کے برابر ہے۔ ——— یہ سب دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا مرحومہ پر فضل و کرم ہے اور بلاشبہ بڑی ہی خوش نصیبی

کی علامت ہے۔

اُن کے انتقال کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ ان کی علالت کا سلسلہ قریباً ڈھائی سال سے سفر حج کے بعد ہی سے جاری تھا اور پہلے کافی عرصہ تک ان کی حالت بہت تشویشناک اور بظاہر مایوس کن رہی تھی لیکن ادھر تقریباً ۵-۶ مہینے سے حالت بظاہر قابل اطمینان حد تک بہتر ہوگئی تھی، اُن کے معالج بھی مطمئن تھے —— دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے لیے ۲۲ شعبان (۸ اکتوبر) کی تاریخ مقرر تھی اور میں نے اُس کی شرکت کے لیے روانگی کا پروگرام بنا لیا تھا کہ دو ہی چار دن پہلے دارالعلوم کے دفتر سے اطلاع آئی کہ فلاں وجہ سے مجلس کی تاریخ دو دن مقدم کردی گئی ہے اور اب شوریٰ کا جلسہ ۲۰ شعبان سے ہوگا۔ اور دارالعلوم ہی کے فلاں ضروری کام کے لیے مجھے ایک دن پہلے یعنی ۱۹ شعبان کو صبح تک دارالعلوم پہونچ جانا چاہیے —— مجھے تاریخ کی یہ تبدیلی (جو ضابطہ کے خلاف بھی تھی) سخت ناگوار گزری اور میں نے وہاں پہونچ کر اس پر سخت احتجاج اور اعتراض بھی کیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انتظام تھا کہ میں مرحوم کے انتقال سے پہلے مکان پر پہونچ جاؤں اور ان کی دلی آرزو کے مطابق اُن کا انتقال میرے سامنے ہو۔ اگر مجلس شوریٰ کی تاریخ میں یہ تبدیلی نہ ہوئی ہوتی تو میں ۲۶ شعبان کو مرحومہ کے انتقال کے وقت لکھنؤ نہیں پہونچ سکتا تھا —— مجھے مجلس کی کارروائی کے سلسلے میں پورے پانچ دن دیوبند میں قیام کرنا پڑا، وہاں سے فارغ ہوکر میں سہارنپور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک شب و روز وہاں قیام کیا۔ جب وہاں سے لکھنؤ کے لیے روانگی کا ارادہ کیا تو حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے بالکل خلاف معمول اور خلاف عادت[1] فرمایا کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو فلاں مقصد سے دو دن اور ٹھیر جاؤ۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسی مجبوری نہ تھی کہ میں ایک دو دن مزید سہارنپور قیام نہ کرسکتا۔ اور حضرت شیخ مدظلہ سے جس طرح کا نیازمندانہ تعلق ہے، اس کا تقاضا تھا کہ میں دو دن اور حضرت ممدوح کی خدمت میں قیام کا فیصلہ کر ہی لیتا، لیکن اس وقت بغیر کچھ زیادہ سوچے سمجھے زبان سے یہی نکلا کہ رمضان مبارک شروع ہونے میں دو ہی چار دن باقی ہیں اس لیے

---

[1] حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا یہ اصول اور معمول ہے کہ وہ اپنے مخلصوں بلکہ بزرگوں سے بھی کبھی مزید قیام کے لیے نہیں کہتے، معلوم نہیں ان کی کیا ضرورت اور مصلحت ہو، خود حضرت ممدوح اپنے اس اصول اور معمول کا ذکر بھی فرمایا کرتے ہیں۔

چاہتا ہوں کہ میں جلدی لکھنؤ پہونچ جاؤں۔ حضرت سے یہ عرض کرنے کے بعد لکھنؤ روانہ ہونے کے لیے رخصتی معانقہ کرکے باہر نکل آیا۔ اور اب سوچنے لگا کہ مجھے حضرت کے فرمانے کے مطابق دو دن اور ٹھہر جانا چاہیے تھا لیکن حضرت سے رخصتی معانقہ کرکے چلا آیا تھا اس لیے لکھنؤ واپسی ہی کا ارادہ کرلیا۔ ۲۶ شعبان کو میرے لکھنؤ پہونچنے کے صرف ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب مرحومہ کے انتقال کا حادثہ پیش آیا تو معلوم ہوا کہ مجلس شوریٰ دارالعلوم کی تاریخ کی خلاف ضابطہ تقدیم اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے فرمانے کے باوجود میرا سہارنپور نہ ٹھہرنا یہ سب منجانب اللہ اس کا انتظام تھا کہ میں مرحومہ کے آخری وقت میں اُن کے پاس موجود رہوں، وہ اس کی بڑی آرزومند تھیں۔

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا۔ مرحومہ کی حالت کئی مہینے سے بہ نسبت سابق کافی بہتر تھی اور میں ان کو اسی حال میں چھوڑ کر دیوبند گیا تھا جب ۲۶ شعبان کو ۱۲ بجے وہاں سے واپس ہوکر مکان پہونچا تو معلوم ہوا کہ ایک دو دن سے درد کی تکلیف ہے جس کا تعلق گردے سے سمجھا جا رہا ہے۔ اُس وقت بھی میں نے ان کی حالت تشویشناک نہیں سمجھی لیکن قریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اچانک ان کی حالت میں تغیر ہوا غالباً قلبی دورہ ہوا اور صرف ۴-۵ منٹ میں روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہوگیا۔

للہ ما اعطیٰ ولہ ما اخذ وعلینا الصبر والرضیٰ بالقضا

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درد کی شدید تکلیف کی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا اور استغفار کرنے کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کو ترسلما سے کہتی تھیں کہ دیکھو تم اس کا خیال رکھنا کہ تکلیف کی شدت میں میری زبان سے کوئی غلط کلمہ نہ نکل جائے۔

اللہ تعالیٰ اپنی اس بندی کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمائے، ہر قسم کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے حسنات کو قبول فرمائے ــــــ اور جن بندوں نے ان کے لیے مغفرت و رحمت کی دعائیں کیں اور اُن کے پسماندگان کی تعزیت کی اور مخلصانہ ہمدردی کا اظہار فرمایا اللہ کو بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے اور دنیا اور آخرت میں فضل و انعام سے نوازے۔ یہ عاجز تو دل سے اُن حضرات کا شکرگزار اور دُعا گو ہے۔

محمد منظور نعمانی

شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب فلسفی رح

(ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

حکیم صاحب مرحوم کی روح پر خدا کی رحمتیں! رمضان مبارک کے دوسرے عشرہ میں ان کی رحلت کا واقعہ پیش آیا تھا جس کو قریباً تین مہینے گزر چکے، اس عرصہ میں اُن کے کریمانہ اخلاق اور مخلصانہ عنایتوں کی یاد برابر تقاضہ کرتی رہی کہ مرحوم کے بارہ میں اپنے احساسات و تاثرات کا الفرقان میں بھی کچھ تذکرہ کرکے اپنے ناظرین سے بھی اُن کے لئے دُعاءِ مغفرت و رحمت کی استدعا کی جائے کہ اس دنیا سے جانے والے کسی محسن یا دوست کے لیے سب سے زیادہ کارآمد نفعمند تحفہ یہی ہو سکتا ہے ـــــ لیکن الفرقان کے پچھلے دو شماروں (بابت شوال و ذیقعدہ) کی تیاری کے وقت طبیعت کا حال کچھ ایسا رہا کہ دو چار سطریں بھی نہیں لکھی جا سکیں ـــــ (اس عرصہ میں اور بھی کئی بزرگوں اور دوستوں کی وفات ہوئی جن کے اس عاجز پر خاص احسانات اور حقوق ہیں، ان شاء اللہ آج ہی کی صحبت میں اُن کے بارہ میں بھی کچھ عرض کیا جا سکے گا ـــــ واللہ الموفق!)

شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب کو عام طور سے ایک باکمال اور حاذق طبیب ہی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا، شروع میں خود راقم سطور کا تعلق اور رابطہ بھی اُن سے اسی حیثیت سے قائم ہوا، اب سے قریباً ۲۰ برس پہلے کی بات ہے، کسی سلسلہ سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جانا ہوا، وہاں نزلہ اور بخار میں مبتلا ہو گیا، میں اُس زمانہ میں یونانی علاج ہی کا عادی تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ہمارے لکھنؤ کے شفاء الملک حکیم عبد المعید صاحب کے چھوٹے بھائی حکیم عبد اللطیف صاحب یہاں طبیہ کالج میں پرنسپل ہیں، اگرچہ کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن حکیم عبد المعید صاحب کے تعلق سے (کہ وہ میرے بڑے ہی

عنایت فرما معالج تھے) انہی کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کیا، میں نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ میں حکیم صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں، انھوں نے کہا کہ ہم ان کو اطلاع کیے دیتے ہیں وہ ابھی تشریف لے آئیں گے، میں نے کہا کہ میں مریض ہوں مجھے خود طبیب اور معالج کے پاس جانا چاہیے۔ لوگوں نے کہا کہ اُن کو آپ جیسے حضرات کے ساتھ ایسا تعلق ہے کہ آپ کے پہونچنے سے انھیں تکلیف ہو گی اور ہم لوگوں سے سخت شکایت ہوگی ـــــــ بہر حال ان حضرات نے حکیم صاحب کو اطلاع دے دی اور وہ فوراً ہی تشریف لے آئے، میں نے حکیم صاحب کو پہلی دفعہ اسی دن دیکھا، نبض دیکھ کے اور حال سُن کے جو شاندہ کا نسخہ لکھا اور فرمایا کہ میں خود ہی دوا تیار کرا کے ابھی بھیجتا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دوا آگئی، میں نے پی لی، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جلد ہی طبیعت اچھی ہوگئی اور ایک ہی دو دن کے بعد میں لکھنؤ چلا آیا ـــــــ کچھ مدت کے بعد حکیم صاحب طبیہ کالج سے ریٹائر ہو کر لکھنؤ تشریف لے آئے۔ پھر کچھ عرصہ کے لیے دہلی کے ایک طبیہ کالج کی پرنسپلی قبول فرمالی، اسی زمانہ میں دہلی میں غالباً پہلی دفعہ سخت قسم کا قلبی دورہ پڑا، کئی دن موت و زیست کی کش مکش میں گزرے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور صحت یاب ہو گئے ـــــــ اس کے کچھ عرصے کے بعد لکھنؤ ہی تشریف لے آئے، اور یہیں مطب شروع فرمادیا۔ یہاں بھی میرے لیے حکیم صاحب سے ربط و تعلق بڑھنے کا بہانہ تو اپنی یا اپنے گھر والوں کی بیماری یا علاج معالجہ کا سلسلہ ہی ہوا لیکن چند ہی ملاقاتوں کے بعد معلوم ہوگیا کہ حکیم صاحب صرف ایک حاذق طبیب ہی نہیں ہیں، بلکہ درس نظامی کے ذریعہ جو ایک خاص قسم کی ٹھوس اور پختہ علمی استعداد پیدا ہو جاتی ہے حکیم صاحب اُس کے بھی سرمایہ دار ہیں، اور بالخصوص دینی علوم سے اچھا خاص تعلق ہے، جب بھی علاج معالجہ ہی کے سلسلے سے مطب میں پہونچ جاتا یا وہ غریب خانہ پر تشریف لاتے تو اکثر اہم دینی موضوعات پر گفتگو فرماتے، کبھی کبھی قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث کے بارے میں تحریری مراسلت بھی فرماتے۔

راقم سطور کی تالیف "معارف الحدیث" کی جب کوئی نئی جلد تیار ہوتی اور میں اُس کا نسخہ ہدیۃً اُن کو بھیجتا تو عموماً ہفتہ عشرہ کے اندر ہی اندر اس کا مطالعہ فرمالیتے اور اس طرح غور سے مطالعہ فرماتے کہ کتابت و طباعت کی بعض اغلاط کی بھی نشاندہی فرمادیتے (تاکہ آئندہ اڈیشن میں تصحیح کی جا سکے)، اور مجھے اپنے تاثرات لکھتے جو میرے لیے بڑے خوش کن ہوتے۔ اُن کا اصرار کے ساتھ

یہ بھی مشورہ تھا کہ جن صحابہ کرام کی روایات معارف الحدیث میں لی گئی ہیں ان سب کا مختصر تعارفی تذکرہ بہتر تو یہ تھا کہ ساتھ ساتھ حاشیہ میں کر دیا جاتا۔ لیکن اب جبکہ کئی جلدیں اس کے بغیر شائع ہو چکی ہیں تو آخری جلد میں ایک ضمیمہ شامل کر کے اس کمی کو پورا کر دیا جائے، میں نے حکیم صاحب کا یہ مشورہ قبول بھی کر لیا تھا، اللہ تعالیٰ اس کو عمل میں لانے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس عاجز کے ساتھ حکیم صاحب کی غیر معمولی عنایت و محبت اور ممدوح کے ساتھ اس ناچیز کی روحی و قلبی مناسبت و وابستگی کی خاص وجہ غالباً دینی مسلک و مشرب کی یگانگت اور اس باب میں ذوق اور طرز فکر تک کی وحدت اور ہمارے اکابر و مشائخ، اسلاف جماعت دیوبند سے ان کی انتہائی عقیدت بھی تھی ـــــ عملی زندگی میں بھی جہاں تک اس عاجز کو معلوم ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے علاوہ اوراد و وظائف کا بھی ایک درجہ میں اہتمام فرماتے تھے ـــــ اخلاق میں تو بہت ہی بلند مقام تھا، میں نے اپنی عمر میں ایسے کریم النفس بہت کم دیکھے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا حکیم صاحب کئی سال سے قلب کے مریض تھے مگر گزشتہ رمضان مبارک کے پہلے عشرہ کے آخری دنوں میں قلبی شکایت شروع ہوئی۔ دو تین دن تک گھر ہی پر علاج معالجہ ہوتا رہا، اس ناچیز کو علم بھی نہیں ہوا، جب مرض نے خطرناک شکل اختیار کر لی تو میڈیکل کالج کے ہسپتال میں داخل کر دیے گئے، اگلے دن صبح کو مجھے معلوم ہوا اور میں عیادت کے لیے گیا۔ میں نے ان کے کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے تیماردار کے ذریعہ یہ پیام بھیجا کہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں لیکن میری شرط یہ ہے کہ نہ میں آپ سے بات کروں نہ آپ مجھ سے کلام فرمائیں، کیونکہ اس وقت بات کرنا آپ کے لیے مضر ہو سکتا ہے، اس کے بعد حاضر ہوا، لیکن حکیم صاحب نے ہمیشہ کی عادت کے مطابق معانقہ کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا اور کچھ بات بھی کرنی چاہی اور مجھے پھر عرض کرنا پڑا کہ اس وقت نہ میں بولوں گا نہ آپ بولیں ـــــ یہی حکیم صاحب کی زندگی کا آخری دن تھا اور یہی راقم سطور کی ان سے آخری ملاقات تھی۔ ـــــ اسی رات میں جو غالباً رمضان مبارک کی بارھویں شب یعنی عشرۂ رحمت کی دوسری رات تھی ہسپتال ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

علی الصبح حکیم مسیح الزماں صاحب ندوی پرنسپل تکمیل الطب کالج نے مجھے ٹیلی فون سے اطلاع کی

اور یہ بھی بتایا کہ نماز جنازہ کے لیے ۴ بجے سہ پہر کا وقت طے ہوا ہے۔

جب میرے کسی بزرگ یا دوست یا محسن کا انتقال ہوتا ہے تو میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے ان کو آخری غسل دوں، کفن پہناؤں اور اپنے ہاتھوں سے قبر میں لٹا کر خدا کی رحمت کے سپرد کروں، اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اکثر یہ خواہش پوری ہو ہی جاتی ہے۔ الحمدللہ حکیم صاحب مرحوم کو بھی غسل دینے کی توفیق ملی، ان کے خاص شاگردوں اور نیازمندوں میں سے طبیہ کالج علی گڑھ کے پروفیسر حکیم افہام اللہ صاحب اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے پرنسپل حکیم مسیح الزماں صاحب ندوی بھی غسل میں شریک اور معاون رہے، اور سب سے زیادہ حصہ ہمارے تبلیغی مرکز لکھنؤ کے رفیق خاص مولوی محمد سلیم کا رہا جو اس کے خاص ماہر ہیں اور اکثر ایسے موقعوں پر اس عاجز کے ساتھ ہوتے ہیں۔

عصر کی نماز کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور خاندانی قبرستان میں جو جھوائی ٹولہ ہی میں حکیم صاحب مرحوم کے مکان کے بالکل قریب ہے تدفین عمل میں آئی اور اپنے اس مخلص محب و محسن کو قبر میں اتارنے اور لٹانے کی بھی اس عاجز کو توفیق ملی۔ (باقی صفحہ ۱۸۹ پر)

محمد منظور نعمانی

قاری محمد شبیر صاحب لکھنوی ثم رائپوری

(ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

اس عاجز راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو توفیق الٰہی نے مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر (قدس سرہٗ) کی خدمت میں پہونچایا اور حضرت سے نیازمندانہ ربط و تعلق قائم ہوا اور پھر ہم خدام کی استدعا پر حضرت کی لکھنؤ بھی بار بار تشریف آوری ہوئی اور کئی کئی ہفتے قیام رہا تو لکھنؤ کے ہمارے بہت سے احباب و مخلصین نے بھی حضرت سے بیعت و اصلاح کا تعلق قائم کیا، ان میں سے کئی ایک پر خدا کی توفیق سے راہِ سلوک کی طلب کا ایسا غلبہ ہوا کہ انھوں نے اپنے کو بالکل ہی حضرت سے وابستہ کردیا اور رائے پور کی خانقاہ ہی میں جا پڑے جہاں اس دور میں طالبین کو بالخصوص کھانے پینے کے معاملے میں بڑے مجاہدہ کی زندگی گزارنی پڑتی تھی ——— انھی میں ایک نہایت مخلص بندے قاری محمد شبیر صاحب بھی تھے۔ اصل وطن تو غالباً بارہ بنکی کے کسی دیہات میں تھا۔ لیکن اُن کے والد صاحب لکھنؤ کے مشہور عطر کے "کارخانہ اصغر علی محمد علی" میں ملازم تھے، اس لیے قاری صاحب لکھنؤ ہی میں رہتے تھے، جہاں تک معلوم ہے گھر کا گزارا اچھا خاصا متوسط درجہ کا تھا۔ لیکن انھوں نے رائے پور کی خانقاہ میں پہونچنے کے بعد پوری زندگی مثالی زہد و توکل اور انتہائی صبر و مجاہدہ کے ساتھ گزاری، دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ جسم میں خون بالکل نہیں ہے۔ گویا کوئی مردہ ہے جو قبر سے اُٹھ کر آگیا ہے۔ مگر اس جسمانی ضعف و نقاہت کے ساتھ دن اور رات ذکر و عبادت میں اتنی مشغولیت کہ عاجز راقم سطور نے اپنی پوری زندگی میں کوئی دوسرا ان کا عدیل و مثیل نہیں دیکھا اور اس کے باوجود ایسی گمنامی بلکہ کس مپرسی کہ خاص دوستوں کے علاوہ کوئی

نہیں جانتا اور سمجھتا تھا کہ یہ بھی کچھ ہیں۔

راقم السطور گزشتہ رمضان المبارک کے دوسرے عشرہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کی خدمت میں ۲۔۳ دن قیام کی نیت سے سہارن پور حاضر ہوا۔ وہاں پہونچکر غالباً سب سے پہلے حضرت شیخ الحدیث ہی سے معلوم ہوا کہ ہمارے قاری محمد بشیر صاحب سخت مریض ہیں اور ان کو علاج اور دیکھ بھال کے لیے رائے پور سے سہارن پور ہی لے آیا گیا ہے اور شاہ مسعود صاحب کے بہٹ ہاؤس کے تحتانی حصّہ میں مقیم ہیں۔ یہ عاجز زیارت وعیادت کے لیے گیا، دیکھ کر اندازہ ہوا کہ حالت نازک اور تشویش ناک ہے۔ خود ان کا بھی اندازہ تھا کہ وقت غالباً قریب ہی ہے ——

میرے سہارن پور پہونچنے کے دوسرے یا تیسرے دن رفیق محترم مولانا علی میاں بھی آگئے، ہم دونوں کو آخری عشرہ شروع ہونے سے پہلے واپس آجانا تھا، لکھنؤ کے دو اور مخلص دوست (بھائی عبدالقادر اور حاجی اسماعیل) جن کا ارادہ آخر رمضان تک حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی خدمت میں سہارن پور قیام کا تھا، ان کو ہم دونوں نے مشورہ دیا کہ وہ زیادہ وقت قاری صاحب کے پاس اور اُن کی خدمت اور دیکھ بھال میں گزاریں اور اسی کو اپنا سب سے اچھا معمول اور وظیفہ سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان حضرات نے ایسا ہی کیا، لیکن قاری صاحب کا وقت موعود قریب آگیا تھا، ہماری واپسی کے ۲۔۳ دن بعد بہٹ ہاؤس ہی میں انتقال ہوگیا اور ان کی ذاکر رُوح اپنے اصل مسکن میں پہونچ گئی۔

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

بندہ کا اصل حال اور درجہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، لیکن اس عاجز نے قاری صاحب کو ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پاک کا خاص مصداق سمجھا۔

مشکوٰۃ شریف میں مسند احمد اور جامع ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالہ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے —— کہ

اغبط اولیائی عندی المومن	میرے دوستوں میں بہت زیادہ قابل رشک میرے
خفیف الحاذ ذو حظ من الصلوٰۃ	نزدیک وہ مومن ہے جو ہلکا پھلکا ہو دنیا کے ساز و
احسن عبادۃ ربہ واطاعہ	سامان اور مال و منال کے لحاظ سے بہت کم ہلکا ہلکا

في الناس وكان غامضا
في الناس لا يشار اليه
بالاصابع وكان رزقه
كفافا فصبر على ذالك
ثم نقد بيده فقال عجلت
منيته قلت بواكيه قل تراثه۔

نماز میں اس کا خاص حصہ ہو اور اپنے رب کی عبادت
و اطاعت خوبی کے ساتھ اور صفت احسان کے ساتھ
کرتا ہو اور یہ سب اخفا کے ساتھ اور خلوت میں
کرتا ہو اور وہ چھپا ہوا اور گمنامی کی حالت میں
ہو، اس کی طرف انگلیوں سے اشارے نہ کیے
جاتے ہوں (کہ یہ فلاں بزرگ اور کامل ہیں) اور
اس کی روزی بھی بقدر کفایت ہو اور وہ اس پر
صابر و قانع ہو ـــــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے اپنے ہاتھ سے چٹکی بجائی اور فرمایا جلدی
آگئی اس کو موت اور اس پر رونے والیاں بھی کم ہیں
اور اس کا ترکہ بھی بہت تھوڑا سا ہے۔

اس حدیث پاک میں قابل رشک اولیاء کی جو صفات بیان فرمائی گئی ہیں وہ جس طرح اس عاجز نے اللہ کے اس بندے (قاری محمد شبیر مرحوم) میں جمع دیکھیں کسی دوسری شخصیت میں ان کا اس طرح اجتماع دیکھنا یاد نہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہم بندوں کے گمان سے بھی بہتر معاملہ فرمائے، مغفرت اور رحمت خاصہ سے نوازے اور درجات عالیہ عطا فرمائے اور ان کے مقبول احوال و اوصاف کا کوئی حصہ ہم کو بھی نصیب فرمائے۔

بقیہ صفحہ ۱۸۶

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس طرح اس نے حکیم صاحب مرحوم کو اس دنیا میں بہت سی نعمتوں اور بلندیوں سے نوازا تھا، اسی طرح قبر و برزخ کی اور اس کے آگے کی آخرت کی منزلوں میں اپنی خاص رحمتوں اور عنایتوں سے نوازے اور پوری پوری مغفرت فرمائے ـــــ اپنے ناظرین کرام سے بھی استدعا ہے کہ وہ بھی دعا فرمائیں اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔

عطریات کی دنیا میں سب سے بہتر اور ممتاز
انمول تحفے
کیپی برانڈ
عطر مجموعہ (اسپیشل)
انٹیمیٹ۔ ٹوپاز۔ سدابہار
اگربتی ہمیشہ استعمال کیجئے
INTIMATE
تیار کردہ
کوثر پرفیومرس
جامع مسجد، بمبئی ۲۰۰۰۰۳

محمد منظور نعمانی

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رح و مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی رح

(ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

ہندوستان کی تقسیم نے جو بہت سے مسائل خاص کر ہم مسلمانوں کے لیے پیدا کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے وہ بزرگ یا عزیز جن سے انتہائی قریبی نسبی یا روحانی تعلق تھا وہ ہم سے امریکا اور روس سے بھی زیادہ دور ہو گئے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ فوجی حکمرانوں نے قریبًا ڈیڑھ سال سے ہر قسم کی کتابوں، رسائل اور اخبارات کی آمد و رفت پر بھی پابندی لگا رکھی ہے جس کی وجہ سے بہت سے اہم واقعات و حادثات کا وقت پر علم بھی نہیں ہو سکتا۔ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری اور مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی متحدہ ہندوستان کے اکابر و مشاہیر علماء میں سے تھے۔ یقینًا ہندوستان کے طول و عرض میں سیکڑوں ایسے مسلمان ہیں جو ان بزرگوں سے محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ان بزرگوں کی وفات اب سے ۲-۳ مہینے پہلے ہوئی لیکن پاکستان کے اخبارات و رسائل نہ آسکنے کی وجہ سے یہاں اس کی اطلاع بہت دیر سے ہو سکی۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری بڑے ممتاز صاحبِ درس اور وسیع النظر عالم تھے، خاص کر فن حدیث میں مولانا کا خاص مقام تھا، اسی کے ساتھ حکیم الامۃ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے، ملک کی تقسیم سے پہلے جالندھر میں ان کا مدرسہ "خیر المدارس" دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور جیسے مدارس کے طرز پر اس وقت کے پنجاب کا سب سے بڑا اور بافیض

مدرسہ تھا، بلکہ جہاں تک علم ہے سندھ اور صوبہ سرحد میں بھی اُس وقت کوئی دینی درسگاہ اس درجہ کی نہیں تھی، تقسیم کے فیصلہ کے بعد جب مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے پاکستان کے علاقہ میں منتقل ہونا پڑا تو مولانا مرحوم نے ملتان میں قیام کا فیصلہ فرمایا اور وہیں "خیر المدارس" قائم کیا، پاکستان کے اس ابتدائی دور میں وہی سب سے بڑا مدرسہ تھا، بعد میں کراچی اور لاہور اور دوسرے شہروں میں بھی بڑے اور مرکزی مدارس قائم ہو گئے۔

تقسیم سے پہلے جب کہ خیر المدارس اور حضرت مولانا کا قیام جالندھر میں تھا کئی بار وہاں حاضری کا موقع ملا، قیام پاکستان کے بعد اگرچہ اس عاجز کے دو سفر مغربی پاکستان کے ہوئے، ایک ۱۹۶۲ء میں اور دوسرا ۱۹۶۸ء میں لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کسی سفر میں بھی ملتان اور خیر المدارس میں حاضری نہ ہو سکی، البتہ ایک دفعہ غالباً کراچی سے لاہور آتے ہوئے ملتان اسٹیشن سے گزرنا تھا، حضرت مولانا کو تار سے اطلاع دلوا دی تھی تاکہ کم از کم اسٹیشن ہی پر زیارت و ملاقات ہو سکے، حضرت ممدوح صاحبزادگان اور خیر المدارس کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ اسٹیشن پر تشریف لائے، میرے لیے کھانا بھی گھر سے پکوا کر ساتھ لائے، جب ٹرین ملتان اسٹیشن پر پہونچی تو حضرت مولانا تشریف فرما تھے، میں نے اتر کر مصافحہ و معانقہ کیا، مولانا نے ساتھ والے مجمع کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے ان سب کو مصافحہ سے منع کر دیا ہے تاکہ گڑبڑ اور تمہیں زحمت نہ ہو اور اطمینان و سکون سے پاس بیٹھنے اور کچھ بات کرنے کا موقع مل جائے ــ میں نے محسوس کیا کہ یہ خاص تھانوی ذوق و مزاج کی برکت ہے) پھر مجھے ساتھ لے کر پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں تشریف لے آئے جہاں اسٹیشن کے ذمہ دار حضرات کی اجازت سے پورے مجمع کے بیٹھنے کا پہلے ہی سے انتظام کر لیا گیا تھا۔ سب لوگ حیرت انگیز نظم و سکون کے ساتھ بیٹھ گئے ـــــ حضرت مولانا نے فرمایا کہ اگر بار محسوس نہ ہو اور طبیعت حاضر ہو تو اس موقع پر کچھ کہہ دے۔ میں نے تعمیل کو سعادت سمجھ کر طلبا سے کچھ عرض کیا اور دعا ہوئی ـــــ جب میری ٹرین کی روانگی کا وقت آیا تو مولانا سے آخری معانقہ کر کے روانہ ہو گیا ـــــ

یہی حضرت مرحوم کی آخری زیارت اور ملاقات تھی ـــــ وفات کی صحیح تاریخ کسی خط سے معلوم نہ ہو سکی، اندازہ یہ ہے کہ گزشتہ رمضان مبارک یا شوال (نومبر یا دسمبر) میں وفات پائی ـــــ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور آپ کے علمی و دینی فیوض کے سلسلہ

کو جاری رکھ کر درجات میں مسلسل ترقی کا وسیلہ بنائے اور اخلاف کو اخلاص اور اتباع مرضیات کی توفیق دے۔

حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی، لدھیانہ کے مشہور قدیم علمی خاندان کے ممتاز فرد تھے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے آخری دور کے تلامذہ میں سے تھے، ابتدائی زمانہ تدریس میں گزرا، اچھے اچھے مدرسوں میں صدر مدرس رہے، بعد میں سیاسی تحریکات میں انہماک ہو گیا، کانگرس اور جمعیۃ علماء سے وابستہ اور اچھے عہدوں پر رہے۔ بار بار جیل بھی گئے، لیکن ملک کی تقسیم کے فیصلہ کے بعد مشرقی پنجاب کے دوسرے عام مسلمانوں کی طرح ان کو بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان منتقل ہونا پڑا۔

راقم سطور پر مفتی صاحب کا خاص الخاص احسان ہے، ناظرین الفرقان میری اس سرگزشت سے الفرقان ہی کے ذریعہ واقف ہو چکے ہیں کہ ابتدائی عربی تعلیم میں میرے کئی سال ضائع ہوئے جس کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مجھے بہت کم عمری میں عربی یعنی اس کی صرف و نحو شروع کرا دی گئی تھی، اس کی مروجہ درسی کتابیں (میزان، پنج گنج، نحو میر وغیرہ) مجھے پڑھائی جاتی تھیں اور اس طرح پڑھائی جاتی تھیں کہ میں اس عمر میں بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا اس لیے وہ پڑھنا میرے لیے سراسر بوجھ تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس لاحاصل اور غیر مفہوم پڑھائی سے ایک طرح کی بیزاری تھی، میرے وطن سنبھل میں کئی عربی مدرسے تھے، اور ہر سال میرا ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا جب ایک مدرسہ میں پڑھتے پڑھتے سال پورا ہو جاتا اور گھر والے محسوس کرتے کہ مجھے کچھ نہیں آیا تو اگلے سال دوسرے مدرسہ میں بھیج دیا جاتا اس دوسرے مدرسہ میں سال پورا کرنے کے بعد بھی میں وہیں رہتا جہاں پہلے تھا ——— کئی سال میرے اسی طرح گزر چکے تھے کہ ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۶ء) میں مولانا مفتی محمد نعیم صاحب سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" میں صدر مدرس ہو کر آ گئے، ہمارے ہی محلہ کے ایک عالم صاحب نے جو اچھے طبیب بھی تھے میرے والد صاحب سے مفتی صاحب کا ذکر کیا اور مشورہ دیا کہ مجھے پڑھنے کے لیے ان کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ اگلے ہی دن میں ان کی خدمت میں "مدرسۃ الشرع" بھیج دیا گیا، انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھ گچھ

کی، اس میں میرے ذاتی اور گھریلو حالات بھی پوچھے اور اندازہ لگایا کہ مجھے اس تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور بس مارے باندھے گھر والوں کے جبر سے اب تک مدرسوں میں جاتا رہا ہوں ــــ انھوں نے اپنی باتوں سے مجھے مانوس کرکے بڑی شفقت سے فرمایا ــــ کہ تم سوچ سمجھ کر اپنے بارے میں خود فیصلہ کرو، اگر تمھارا ارادہ عربی پڑھنے کا نہیں ہے، کچھ اور پڑھنا یا کچھ اور کرنا چاہتے ہو تو صفائی سے ہم کو بتا دو، ہم تمھارے والد صاحب کو مشورہ دیں گے کہ تم کو اس لائن پر لگائیں، اور اگر تمھارا ارادہ عربی پڑھنے کا ہو تو ہم تمھیں پڑھائیں گے اور خدا نے چاہا تو تم بہت جلد پڑھ لوگے ــــ ان کے اس مشفقانہ اور حکیمانہ طرز عمل نے دل کے رُخ کو بدل دیا اور میں نے پڑھنے کا ارادہ کرلیا اور مفتی صاحب سے عرض کردیا۔ انھوں نے ایک خاص انداز سے پڑھانا شروع کیا اور واقعہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کئی سال میں نہیں پڑھ سکا تھا وہ میں نے ان سے چند مہینوں میں پڑھ لیا ــــ مفتی صاحب تو اس سال کے بعد سنبھل تشریف نہیں لائے لیکن میری تعلیم کی گاڑی صحیح لائن پر چل پڑی اور علم کا جو حصہ مقدر تھا وہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نصیب فرما دیا ــــ بہرحال میری تعلیم میں بنیادی حصہ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی علیہ الرحمہ کا ہے اس لیے وہ میرے بہت بڑے محسن تھے ــــ پچھلے دنوں دارالعلوم دیوبند جانا ہوا تو پہلے وہیں اُن کی خبر وفات سُنی ــــ اس کے بعد ساہیوال (پاکستان) سے ان کے بڑے صاحب زادے مولانا ضیاء الحسن صاحب کا اطلاعی مکتوب بھی ملا ــــ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے، بالخصوص اس ناچیز پر اُن کا جو علمی احسان ہے اُس کا اُن کو بہتر سے بہتر صلہ دار آخرت میں عطا فرمائے اور فضل خاص سے نوازے ــــ ناظرین کرام سے بھی دُعا کی استدعا ہے۔

محمد منظور نعمانی

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی مرحوم

(ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

الفرقان کے اکثر ناظرین کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی کے حادثۂ انتقال کی اطلاع ہو چکی ہوگی، مولانا موصوف حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے کئی رشتوں سے قریبی عزیز اور برادر نسبتی تھے۔ اب سے ۳۲-۳۳ سال پہلے جب حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں اس عاجز کی آمد و رفت شروع ہوئی تو یہ تبلیغی کام جو انہی کی طرف منسوب ہے (اور اب عالمی کام بن چکا ہے) اُس وقت بہت محدود پیمانہ پر تھا، میوات اور دہلی شہر کے ایک مخصوص طبقہ کے علاوہ بس چند قریبی اضلاع کے کچھ مخلصین کا اُس سے تعلق تھا۔ اور درحقیقت اس کی کل کائنات بس یہ تھی کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ اپنی مضطرب روح، اپنے [illegible] سب، اپنے نحیف جسم اپنے حال اور اپنی زبان سے اس کے داعی تھے، اُن کے تربیت یافتہ چند میواتی اُن کے ہاتھ پاؤں اور یہ مولانا احتشام الحسن صاحب اس کا انتظامی دماغ تھے ——— ذی استعداد عالم اور صاحب قلم بھی تھے، اُن کا ایک چھوٹا سا رسالہ "پستی کا واحد علاج" اُس ابتدائی زمانہ میں بلا شرکت غیرے اس دعوتِ تبلیغ کا گویا تعارفی اور توضیحی لٹریچر تھا ——— اُس زمانہ میں تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے حضرت مولاناؒ کے بعد انہی سے زیادہ واقف تھے ——— حضرت مولانا محمد یوسفؒ کا تعلق اس کام سے اُس وقت بس اتنا ہی تھا کہ اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل میں کچھ حصہ لے لیتے اور مہمانوں کی خبر گیری میں شرکت کر لیتے تھے ——— لیکن حضرت کے وصال کے بعد دفعتہً اُن کا حال ایسا بدلا کہ گویا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی روح اپنی پوری جذبی

اور بے چینی کی کیفیت کے ساتھ اُن کے اندر آگئی ـــــ اور حضرت مولانا احتشام الحسن صاحب کی صحت و توانائی نے اچانک جواب دے دیا اور گویا وہ حضرت کے مرض کے وارث بن گئے ـــــ چند ہی روز کے بعد صحت کی اس خرابی سے مجبور ہو کر اپنے وطن کاندھلہ آجانا پڑا۔ کم و بیش اسی وقت سے امراض کا تسلسل رہا، لیکن قلم کے ذریعہ برابر کام کرتے رہے ـــــ ادھر کئی سال سے غیر مسلموں میں دعوت اسلام کا اُن کے دل میں خاص داعیہ پیدا ہو گیا تھا اور یہی اُن کا مشن اور موضوع فکر بن گیا تھا، اس سلسلہ کے اُن کے متعدد رسالے اور مقالے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ۔ تعلق رکھنے والوں سے وہ اس کے لیے خط و کتابت بھی کرتے تھے گزشتہ سال جبکہ برسوں کی مسلسل بیماری کی وجہ سے وہ سفر کے بالکل لائق نہ تھے، انھوں نے راقم سطور اور رفیق محترم مولانا علی میاں سے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے لکھنؤ اور رائے بریلی تک کا سفر بھی فرمایا۔ اگرچہ ہم دونوں اپنے کچھ تجربات اور اپنی خاص رائے کی بنا پر ان کی رفاقت اور ہم سفری کا فیصلہ نہیں کر سکے لیکن اُن کے جذبۂ صادق سے بہت متاثر ہوئے ـــــ ادھر کئی مہینے سے تکالیف میں بہت اضافہ ہو گیا تھا بالآخر علاج کے لیے دہلی لے جانا طے کیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے آپریشن کا فیصلہ کیا ـــــ آپریشن کیا گیا تو معلوم ہوا کہ آنتوں میں کینسر ہے جس پر طویل مدت گزر چکی ہے اور آخری حد تک پہنچ چکا ہے، بے چارے ڈاکٹروں نے اپنی سی کوشش کی لیکن وقت موعود آچکا تھا، جب تک ہوش اور زبان نے ساتھ دیا ذکر و دعا کا سلسلہ جاری رہا، وسط شوال میں اسپتال ہی میں انتقال فرمایا

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تلمذ اور بیعت کا تعلق حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ سے تھا، بعد میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے تعلق قائم کر لیا تھا، حضرت نے وصال سے چند ساعت پہلے جن چھ حضرات کو اجازت دی تھی اُن میں مولانا مرحوم بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص الخاص معاملہ فرمائے۔

---

[1] دارالاشاعت محلہ مولویان کاندھلہ ضلع مظفر نگر سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ

(ربیع الاول ۱۳۹۲ھ کے شمارہ میں شائع ہوا)

۲۰، ۲۱ صفر مطابق ۵، ۶ اپریل کی درمیانی شب میں دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر، حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب نے اپنے وطن مراد آباد میں* وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید فخر الدین احمد علیہ الرحمۃ کی عمر بیاسی سال بتائی گئی ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے طویل مرض الوفات (۱۹۵۷ء) میں آپ کی مسند درس کو آباد رکھنے کے لیے آپ ہی کی خواہش پر مولانا (سید فخر الدین احمد صاحب) نے مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد کی اپنی دیرینہ مسند اور حلقہ احباب و وابستگان اور عیال و خدام کو خیر باد کہہ کر دار العلوم دیوبند کا قیام اختیار فرمایا۔ اور وفات سے بس چند ماہ پیشتر تک یہاں کی مقدس مسند حدیث آپ کے دم سے اسی شان سے آباد رہی جو آپ کے پیشروؤں کی جلالت اور خدا کی نظر عنایت نے اسے بخش رکھی ہے اور جس کے ساتھ اس درسگاہ کا نام اپنے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے حلقۂ تعارف میں وابستہ ہے۔

مولانا مرحوم، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، پھر خاتم المحدثین حضرت علامہ انور شاہ صاحب کے چشمۂ فیض سے بھی خوب خوب استفادہ کیا تھا۔ شروع ہی سے دار العلوم کے بہت چمکتے ہوئے فضلاء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ دار العلوم دیوبند ہی

---

* آبائی وطن تو ہاپڑ (ضلع میرٹھ) ہے لیکن مولانا نے مراد آباد ہی کو وطن بنا لیا تھا۔

کی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم منصوبے کے ماتحت، مراد آباد کی سرزمین پر شاہی مسجد میں وجود پانے والی عربی درسگاہ جامعہ قاسمیہ کی مسند حدیث ایک مدت تک آپ کی ذات سے رونق پاتی رہی۔ ۱۹۴۷ء کے جن دنوں میں مغربی یوپی سے مغربی پاکستان کے دور دراز خطوں تک ہنگامہ کشت و خون برپا تھا، یہی دن عربی مدرسوں میں تعلیمی سال کے آغاز کے تھے۔ راقم سطور کا یہ سال حدیث کی تعلیم یعنی فراغت حاصل کرنے کا سال تھا۔ لکھنؤ سے دیوبند جانا تھا جہاں تین سال پہلے سے تعلیمی سلسلہ تھا، مگر راستے مسدود۔ والد ماجد کی رائے سے اس وقت تک کے لیے جب تک کہ دیوبند کا راستہ قابل سفر ہو، مراد آباد میں اپنے تایا جناب مولوی محمد حسن بدر سنبھلی کے یہاں قیام کر کے حضرت مولانا فخر الدین صاحب کے حلقۂ درس میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اس طرح کوئی دو مہینے اسی شاہی مسجد کی درسگاہ میں آپ سے استفادے اور تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ اور غالباً یہی آپ کو پہلی بار دیکھنے کا بھی اتفاق تھا۔

عمر شریف اُس وقت بھی ساٹھ کا خط تو پار کر ہی چکی ہوگی۔ سر کے بالوں میں تو سیاہی کافی تھی مگر ڈاڑھی جہاں تک یاد آتا ہے بالکل سفید تھی، قویٰ میں بھی ضعف کے آثار۔ مگر کیا حسن صورت و قد و قامت تھا کہ کہیں سے بھی آپ، جیسے نہیں لگتی تھی۔ کھدر پوشی کے باوجود لباس کی نظافت سپیدی اور سر سے قدم تک سلیقے اور قرینے کی گلکاری اس سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی۔ مسند پر بیٹھے ایک مرقع نور جلوہ افروز ہوتے [illegible] بیان و ادا کی وضاحت و فصاحت اور آواز کی کھنک دار لطافت سے درس کی تقریر یوں لگتی جیسے نرم و نازک ہونٹوں سے پھول جھڑ رہے ہوں تقریر حشو و زوائد سے بالکل پاک، جچے تلے افادات پر مشتمل ہوتی۔ دیوبند کی بالعموم لمبی لمبی تقریروں کے چسکے کے باوجود یہ نیا ذائقہ زیادہ پسند آیا۔ اور اس لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی سب سے بڑی خصوصیت آج بھی بس یہی یاد ہے اسی کے ساتھ اُس وقت کا یہ تاثر بھی کہ مولانا کے پائے کے استاد کے لیے طلبا کی جیسی جماعت ہونی چاہیئے، نہ کثرت کے اعتبار سے وہ یہاں ہے نہ کیفیت کے اعتبار سے، اس لیے مولانا کی طبیعت کچھ کھلتی نہیں۔ کوئی شایان شان حلقہ میسر ہو تو طبیعت کے انشراح سے اس درس کا رنگ کچھ اور ہی نکلے۔ مولانا کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ شایان شان کوئی مسند اور مدرسہ انھیں ملے۔ مگر ہماری اس

پیڑھی کے بزرگوں کی شان یہ نہ تھی کہ وہ اپنے مرتبے کے ایسے تقاضوں کے پیچھے دوڑا کریں۔ وضعداری اور بزرگان رفتہ کے ایماء کی پاسداری بھی ان کے یہاں بڑی چیز تھی، جہاں بٹھا دیے گئے وہاں سے از خود ہٹنے کی بات یہ اس بنا پر بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ چنانچہ دس سال مولانا کو اور وہیں گزر گئے اور وہ اسی مختصر سی درسگاہ اور چھوٹی سی جماعت طلباء پر قانع رہے جو ۱۹۴۷ء میں راقم حروف نے دیکھی تھی لیکن اُن کے لیے شایان شان جگہ مقدر تھی ایسی بے نفسیاں بھی کچھ نہ کچھ اثر رکھتی ہی ہیں جن بزرگوں کے حکم سے وہ مدرسہ شاہی کی تدریس پر قانع ہوئے بیٹھے تھے اُن ہی کے سلسلہ جانشین کی نظر انتخاب کا فیصلہ ہوا کہ اُس کی جانشینی اور بزرگوں کی مسند کو آباد رکھنے کی ذمہ داری مولانا قبول کریں   اب مولانا اُس مسند کی رونق تھے جس سے اونچی مسند کا تصور برصغیر کا کوئی عالم نہیں کر سکتا۔

قویٰ میں بہت ضعف آچکا تھا، امراض چشم خاص طور سے لاحق ہو گئے تھے، مگر جس احساس ذمہ داری اور بلند ہمتی سے مولانا نے یہ بار امانت اٹھایا وہ ایک مثال ہے۔ دارالعلوم کے دورۂ حدیث کی گرانباری کا تصور باہر کے لوگ نہیں کر سکتے۔ شیخ الحدیث اور شوقین طلباء کے لیے یہ ایک مجاہدہ کا سال ہے۔ کمر تختہ ہو جاتی ہے، آنکھیں پوری نیند کو ترسی ہوئی رہتی ہیں کھانے پینے کو ٹھیک سے وقت نہیں ملتا اور ملے بھی تو اس دماغ سوزی میں غذا اور اس کا نفع آپ سے آپ کم ہوتے جاتے ہیں۔ آخری بار زیارت گزشتہ سال اگست میں دیوبند کی قیام گاہ پر ہوئی۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ انبساط و شفقت کے تجربوں کے باوجود دیر تک خدمت میں حاضر رہنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ بات چیت سے ضعف، خصوصاً دماغی ضعف، انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ مگر "چکی کی مشقت" اس عالم میں بھی اپنی جگہ تھی، درس بدستور ہو رہا تھا۔

اس سے مولانا کے احساس ذمہ داری اور عالی ہمتی ہی پر روشنی نہیں پڑتی کہ تنہا یہ دونوں چیزیں کسی درجہ کی بھی ہوں، اس عالم ضعف و پیری میں، دارالعلوم کے روایتی درس حدیث کا بوجھ اٹھائے رکھنے کی قوت عطا نہیں کر سکتیں۔ اس سے مولانا کے اندر کسی ذوق و شوق کی اُس کیفیت کا بھی اظہار ہوتا ہے جس کی کرشمہ کاری سے بہت سے بزرگوں کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ مثلاً یوں ایک منٹ بھی کھڑے نہیں رہ سکتے تھے مگر جماعت میں لا کر کھڑے کر دیے جاتے تو پوری

نماز صحت مندوں کی طرح ادا کرتے تھے۔ عمر بھر کی خدمت، بے نفسی اور اخلاص نیت کی برکت سے حدیث نبوی کے ساتھ مولانا کے ذوق و شوق کی کبھی بظاہر ایسی ہی بلند نسبت قائم ہوگئی تھی کہ ادھر مسند پر جاکر بیٹھے اور اُدھر ضعف و نقاہت کے تمام احساسات دب گئے۔ اور جو لوگ دوسرے مقام پر چند کلمات کی ادائیگی میں بھی تکلف محسوس کرتے، وہ دیکھتے کہ

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

آخر ۱۹۷۶ء میں باقاعدہ امراض حملہ آور ہوگئے اور تاب مقاومت جواب دے گئی تو مرادآباد لے آئے گئے لیکن خدا کے کرم سے افاقہ ہوا تو پھر یہاں کا قیام گوارا نہ تھا اور اسی احساس ذمہ داری اور ذوق و شوق نے ایک بار پھر دیوبند پہنچا دیا۔ لیکن اب مشیت تھی ہی نہیں کہ یہ چشمۂ فیض جاری رہے، ناچار پھر مرادآباد تھوڑے ہی دن بعد واپس آنا پڑا اور مختلف علاجوں اور صحت و مرض کے نشیب و فرازوں کا مقررہ حصہ پورا کر کے بندہ اپنے رب سے جا ہی ملا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین وبعثہ فی زمرۃ عبادہ المنتخبین الغر المحجلین ———

دارالعلوم دیوبند کے لیے اب مولانا کا بدل تلاش کرنا بڑا مسئلہ ہے۔ دیکھیے مشیت الٰہی کا کیا فیصلہ سامنے آتا ہے۔

دارالعلوم کی صدارت کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کی صدارت میں بھی، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد آپ کی جانشینی مولانا کے حصہ میں آئی۔ اور یہ منصب بھی آخر دم تک آپ کے ساتھ وابستہ رہا۔ ذہنی اعتبار سے جمعیۃ کے مسلک سے آپ کو پوری ہم آہنگی بھی تھی۔ آزادی کی تحریک میں اس جماعتی نظام کے تحت آپ کا عملی حصہ بھی رہا۔ قید و بند کے مرحلے بھی طے کیے۔ مگر اصل ذوق علمی اور تدریسی ہی تھا۔ اس لیے نہ پہلے کبھی اس معاملے میں زیادہ نمایاں ہوئے نہ جمعیۃ کی صدارت کے بعد کوئی خاص عملی سرگرمی اختیار کی۔ بس ایک اعزازی نوعیت کے صدر تھے۔ اس لیے اس پہلو کا بس تذکرہ ہی اُن کی یاد کے اس موقع پر کیا جاسکتا ہے، کوئی تبصرہ بامعنی نہیں۔

———

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی گرانقدر تالیفات

اسلام کیا ہے؟

نہایت آسان زبان اور بیحد دل نشین اور پراثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ ـــــ دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور اس پر عمل انشاء اللہ کافی ہے۔ مولانا موصوف کی سب سے زیادہ مقبول کتاب۔ قیمت مجلد صرف ۴/۵۰

دین و شریعت

اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت، اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۵/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

قرآنی ہدایات اور اس کی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت موثر اور روح پرور تشریح کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۔/۷، انگریزی ۔/۱۵

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی سوانح حیات ـــ آپ کی عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم تجدیدی کارنامہ کی تفصیل جس کے نتیجہ میں اکبر اور اس کے درباریوں کا چلایا ہوا "دین الٰہی" تاریخی قصہ ہو کر رہ گیا اور سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے صحیح اسلام کی طرف مڑ گیا۔ قیمت مجلد ۔/۱۲

معارف الحدیث

(احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ)

مولانا نے احادیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے۔ اس سلسلے کی ۶ جلدیں الحمد للہ مکمل ہو چکی ہیں۔ جلد اول ۹/۵۰، جلد دوم ۔/۱۱، جلد سوم ۱۳/۵۰، جلد چہارم ۔/۱۰، جلد پنجم ۱۲/۵۰، جلد ششم ۲/۵۰ (جلد کے لیے جلد کی قیمت علاحدہ سے لگائی جاتی ہے۔)

(انگریزی ایڈیشن۔ معارف الحدیث کی پہلی جلد اور نصف دوم کا انگریزی ترجمہ ایک جلد میں شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۔/۳۲)

تصوف کیا ہے؟

یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود افادہ و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے اپنے موضوع میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۔/۵

منتخب تقریریں

مولانا موصوف کی ایمان افروز اصلاحی و تبلیغی تقاریر کا مجموعہ جو اپنے اندر افادیت اور جامعیت کے ہزاروں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ قیمت مجلد صرف ۔/۶

ملفوظات حضرت مولانا الیاسؒ

جن لوگوں نے حضرتؒ کو نہیں پایا وہ ان کے ملفوظات کے مطالعہ سے آپؒ کو پوری طرح سے جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔

قیمت ـــــ ۳/۵۰

کلمہ طیبہ کی حقیقت

اسلام کا بنیادی کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایک عہد و میثاق ہے جو اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس عہد کی حقیقت کو سمجھے اور اس کو زندگی بھر نباہنے کی کوشش کرے۔ قیمت صرف ۰/۷۵

برکات رمضان

ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت موثر اور شوق انگیز بیان ——— قیمت صرف ۱/۵۰

آپ حج کیسے کریں؟

حج کے موضوع پر اردو میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ کتاب ——— اپنی اس خصوصیت میں اب بھی منفرد و ممتاز ہے کہ یہ بہت آسان اور دلنشین انداز میں حج کا طریقہ اور احکام و مناسک بھی بتاتی ہے اور وہ ذوق و شوق بھی پیدا کرتی ہے جو حج و زیارت کی جان ہے۔ قیمت ۴/

آسان حج

یہ آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں؟" کا خلاصہ ہے۔ قیمت ۱/۲۵

فیصلہ کن مناظرہ ——— اکابر علماء دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب ——— کتاب کے مقدمہ میں بریلی کے اس تکفیری فتنہ کی حقیقت اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اب اہل حق کو اس سے کیسے نمٹنا چاہیے۔ قیمت ۲/۵۰

نماز کی حقیقت

اسلام میں ایمان کے بعد نماز ہی کا درجہ ہے۔ مگر کیا ہم نماز کو ایسی ہی اہمیت کے ساتھ ادا بھی کرتے ہیں؟ کیوں اس لیے کہ ہم عام طور پر اس کی پوری حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ بیحد مفید کتاب ہے۔ قیمت ۱/۷۵

انسانیت زندہ ہے

یہ کتابچہ مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پراثر واقعہ بیان کیا ہے جذبۂ انسانیت و ایثار کی افزائش کے لیے بے حد مفید کتاب ہے قیمت صرف ۰/۸۰

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟
اور مسئلہ حیات مسیح و نزول مسیح

مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ——— رد قادیانیت پر مدلل کتاب ہے۔ اس میں قرآن و حدیث اور عقل کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل عام فہم پیرائے میں لکھا گیا ہے جو عوام و خواص کے لیے یکساں تسلی بخش ہے۔ قیمت مجلد صرف ۳/-

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قادیانیت پر مولانا کا یہ مختصر رسالہ دریا بکوزہ کا مصداق ہے۔ قیمت ۰/۸۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات حضرت شاہ شہیدؒ جیسی مقدس ہستی پر جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے خون کا کفن پہنا۔ معاندین اہل بدعت نے خوف خدا سے بے نیاز ہو کر جو مکروہ الزامات لگائے ہیں۔ ان کا تسلی بخش اور مدلل جواب۔ قیمت ۲/۵۰

کتب خانہ الفرقان کی چند دیگر مایہ ناز مطبوعات

تجلیات ربانی (حصہ اول)

(تلخیص و ترجمہ از مولانا نسیم احمد فریدی) پورے اسلامی ادب میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے ان مکاتیب میں احسان و تصوف، تعمیر باطن، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین و ترویج شریعت کی ترغیب اور امت مسلمہ کی عام رہنمائی کا وہ سامان موجود ہے جس کی صدائے بازگشت نے گذشتہ تین چار صدیوں میں امت مسلمہ کے حق میں میر کارواں کا کام انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی مولانا موصوف نے حاشیہ پر مکتوب علیہم کے حالات بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جس نے اس کتاب کی اہمیت۔ اور عظمت کو دو بالا کر دیا ہے۔ قیمت ۱۳/۵۰

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ

حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کے مکتوبات کا ذخیرہ حضرت خواجہ کے ارشاد و ہدایت کے پورے کمالات کا آئینہ دار ہے۔ آپ کے گرانقدر مکتوبات کو اردو زبان میں مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے تلخیص کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ قیمت ۷/-

وصایا شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے وصایا جو اپنے اندر بڑی کشش اور دلآویزی رکھتے ہیں، اب تک مخطوطہ کی شکل میں عربی زبان میں تھے۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے ان کا انتخاب کر کے اپنے شگفتہ انداز میں اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ قیمت ۱/۲۵

حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی۔ تبلیغی تحریک کے بانی حضرت مولانا الیاسؒ کی مکمل سوانح حیات۔ مولانا کی شخصیت، ان کے اخلاق و عادات، ان کے امتیازی اوصاف، ان کے خاص افکار و نظریات ان کی دینی دعوت کا پس منظر، اس کا ارتقاء اور اس کے اصول و طریق کار کو سمجھنے کے لیے یہ واحد کتاب ہے۔ قیمت ۴/۵۰

صحبتے با اہل دل

مرتبہ مولانا ابو الحسن علی ندوی۔ حکیم نکتہ داں عارف باللہ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی (عرف پیر نھنے میاں) کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ جن میں عصر حاضر کے ذوق اور مزاج کے مطابق زندگیوں کی اصلاح کا پیغام، ایمان و یقین و کیفیت احسانی پیدا کرنے کا راز، بیان اور حکایات و تمثیلات کے پیرایہ میں تصوف اسلامی کا عطر آگیا ہے۔ قیمت ۸/-

تذکرہ حضرت صوفی عبد الربؒ

حضرت صوفی سید عبد الرب علیہ الرحمہ کے حالات زندگی ان کے اللہ پرایمان کامل اور ان کی بامقصد اور اصلاحی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز اس تذکرہ میں ان کی چند منتخب اصلاحی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ قیمت ۲/-

بریلوی فتنہ کا نیا روپ

از مولانا محمد عارف سنبھلی۔ ارشد القادری صاحب کی تصنیف "زلزلہ" کا تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب (جدید ایڈیشن قیمتی اضافہ کے ساتھ شائع ہو گیا) قیمت ۶/-

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اہم اردو تصنیفات

تاریخ دعوت وعزیمت

عالم اسلام کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ

نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب "دعوت وعزیمت" کا مفصل

تعارف، تین جلدوں میں مکمل حصہ اول ۴۹۶ صفحات زیر طبع

حصہ دوم ۴۰۴ صفحات ۱۵/- حصہ سوم ۴۰۴ صفحات زیر طبع

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر

وہ شہرۂ آفاق اور انقلاب انگیز کتاب جس کے اردو،

انگریزی، ترکی، فارسی وغیرہ تراجم کے علاوہ صرف

عربی میں ۱۲ ایڈیشن عرب ممالک میں شائع ہو چکے ہیں

صفحات ۴۵۰، قیمت مجلد -/۱۲

پرانے چراغ

مولانا موصوف کی تازہ ترین تصنیف

معاصر شخصیتوں، بزرگوں، استادوں، اور

دوستوں سے متعلق تعارفی مضامین، مشاہدات، واقعات

اور تأثرات ومعلومات کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس میں

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی،

مولانا مدنی، مولانا تھانوی، شاہ وصی اللہ رحمہم اللہ،

جیسے بلند پایہ حضرات کے علاوہ مصنف کے کچھ

اساتذہ، رفیقوں اور چند گمنام ہستیوں کا تذکرہ

آگیا ہے۔ صفحات ۴۲۴

قیمت مجلد مع گردپوش -/۱۶

ارکان اربعہ

اسلامی عبادات کتاب وسنت کی روشنی میں اور عیسائیت

ویہودیت نیز ہندو مذہب کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ

تقریباً ۴۰۰ صفحات سائز ۲۶×۲۰ قیمت مجرت -/۱۲

جب ایمان کی بہار آئی

مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید (م ۱۲۴۶ھ)

اور آپ کے عالی ہمت رفقاء کے ایمان افروز واقعات

جن کی کوششوں سے ہندوستان میں ایمان کی بہار

آئی اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہوگئی۔

۲۷۲ صفحات۔ قیمت مجلد -/۱۲

دریائے کابل سے یرموک تک

مغربی ایشیا کے مسلم اور عرب ممالک افغانستان

ایران، لبنان، شام، عراق اور شرق اردن کے

ایک معلوماتی دورہ کی مفصل روداد وڈائری۔ جس میں

ان ممالک کی دینی، فکری اور اقتصادی صورت حال کی

سچی تصویر اور وہاں کی دینی واصلاحی تحریکات، تضاد و

عوامل، واثرات اور ذہنی وروحانی کشمکش کا بالغ نظرانہ

جائزہ لیا گیا ہے صفحات ۳۰۴۔ خوبصورت گردپوش

سے مزین بہترین کتابت وطباعت قیمت -/۱۴

ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں

یعنی موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کا مذہبی، تمدنی اور معاشرتی تعارف، ان کے عقائد، عبادات، مذہبی تہواروں، رسم ورواج، معاملات و اخلاق اور ان کی ملی خصوصیات کا بیان۔ ایک غیر جانبدارانہ جائزہ۔ ایک واقعی تصویر۔ قیمت =/۵

معرکۂ ایمان و مادیت

سورۂ کہف کا مطالعہ تفسیر قرآن، حدیث، قدیم تاریخ، جدید علوم اور حالات حاضرہ کی روشنی میں۔ اور سورۂ کہف کا عجیب سبق آموز قصہ۔ قیمت =/۵

مولانا کے دیگر خطبات و مقالات

پیام انسانیت	۲/۵۰
ایک بہتر ہندوستانی سماج	-/۱
عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب	-/۸۵
خواص — ملت میں ان کا مقام	-/۵۰
بعثت تاریخ عالم	-/۲۵
طالبان علوم نبوت	-/۶۰
مسلمانان ہند سے صاف صاف باتیں	-/۷۵
سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں	-/۱
اسلام مکمل نظام مستقل تہذیب	-/۸۵
سیاسی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ	-/۷۵
دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں	-/۷۵
نشان راہ	-/۷۵
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ	-/۱
مرد خدا کا یقین	-/۵۰
محسن عالم	-/۵۰

تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ

چودھویں صدی ہجری کے مشہور و مقبول بزرگ اور عالم دین اولیس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات، کمالات، ارشادات و ملفوظات۔ قیمت =/۴

پاجاسراغ زندگی

مولانا مدظلہ کی چند اہم تقاریر کا مجموعہ جن میں درد و سوز اور ایمان و یقین کی کیفیات کے ساتھ ساتھ ان موضوعات کے طویل سفر و مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ۔ کتاب کی سطر سطر سے عیاں ہے۔ قیمت =/۴

مولانا کی تصانیف انگریزی میں

فورسیز آف اسلام		-/۳۰
ٹیلس آف دی پرافٹ		-/۵
سیویئرس آف اسلامک اسپرٹ	اول	-/۴۰
〃 〃 〃 〃	دوم	-/۳۵
سیرت سید احمد شہید		-/۴۰
اسلام اینڈ دی ورلڈ		-/۱۸
ویسٹرن سویلائزیشن		-/۲۲
فیتھ ورسز میٹیریلزم		-/۱۰
اسپیکنگ پلینلی ٹو دی ویسٹ		-/۵
دی ورلڈ آف اسلام ٹوڈے		-/۶۰
ریلیجن اینڈ سویلائزیشن		-/۳
قادیانزم — اے کریٹیکل اسٹڈی		-/۱
اسلام اینڈ احمدزم		-/۲
گلوری آف اقبال		-/۱۸
دی مسلمان		-/۱۰

مستند تفاسیر قرآن اور علوم قرآنی پر منتخب کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تفسیر ماجدی اول دوم	۳۵/-	قرآن اور تصوف	۵/-
تفسیر ابن کثیر مکمل مجلد	۱۳۰/-	فہم قرآن	۸/۷۵
تفسیر حقانی مکمل	۱۱۰/-	قرآن عظیم از رجبریہ تعلیم	۱/-
تفسیر بیان القرآن مکمل جرمکہ	۱۶۰/-	رہنمائے قرآن	۱/۲۵
تفسیر موضح القرآن مکمل	۴۰/-	وحی الٰہی	۵/-
تفسیر حل القرآن مجلد	۱۰۰/-	بشریت انبیاء	۲/۵۰
〃 〃 غیر مجلد	۹۰/-	اعلام القرآن	۲/۵۰
تفسیر مظہری	۲۱۵/-	فضائل قرآن	۱/-
تفسیر الفوز الکبیر اردو	۲/۵۰	قصص و مسائل	۲/-
لغات القرآن غیر مجلد مکمل	۵۷/۵۰	تعلیم القرآن	۴/۷۵
قصص القرآن 〃 〃	۲۶/۵۰	جمع و تدوین قرآن	۳/-
ارض القرآن مکمل	۱۰/-	اعجاز القرآن	۱/۷۵
ما درس القرآن مجلد	۱۵/-	قرآن کا تعارف	۲/۷۵
نزول اور تعمیر سیرت	۸/۵۰	قرآن کی باتیں	۲/-

تراجم احادیث اور متعلقات حدیث

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تفہیم البخاری ۱ تا ۱۳	۳۹/-	انتخاب صحاح ستہ	۸/-
مسند شریف مترجم	۱۰۰/-	ترجمان السنہ مکمل غیر مجلد	۹۴/-
تقریر بخاری	۱۲/۵۰	کتابت حدیث	۳/۵۰
انوار الباری شرح بخاری	۱۱۵/-	نصرۃ الحدیث	۳/-
خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی اردو	۱۵/-	مآثر و معارف	۱۵/-
		معارف الحدیث مکمل مجلد	۸۵/-
[illegible] شریف مکمل	۲۵/-	تحریک علما اور ان کے علمی کارنامے	۱۰/-

سیرت نبوی صحابہ کرام اور مشائخ پر بہترین کتب

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرت النبی مکمل	۱۳۳/-	الفاروق	۱۵/۷۵
رحمۃ للعالمین	۳۶/-	مشکل کشا	۲/۵۰
پیغمبر عدل	۱۰/-	فاطمہ کا چاند	۳/۲۵
رسول اللہ	۱/۸۰	اسوۂ صحابیات	۳/-
اصح السیر	۲۴/-	رسول اللہ کی صاحبزادیاں	۱/۷۵
خطبات مدراس	۶/۲۵	امت مسلمہ کی مائیں	۲/۵۰
رحمت عالم	۳/۲۵	سیر الصحابیات	۳/۷۵
اسوۂ حسنہ	۳/۷۵	سیر الصحابہ ششم	۹/۴۰
رسول اکرم کی سیاسی زندگی	۱۲/-	〃 〃 ہفتم	۹/۷۰
ہمارے حضور	۲/-	حیاۃ الصحابہ مکمل مجلد جرمکی	۴۴/-
پہلی تقریر سیرت	۳/-	چاند تارے	۳/-
دوسری تقریر سیرت	۳/۷۵	اسوۂ صحابہ اول	۹/۸۰
نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب	۲/۵۰	〃 〃 دوم	۹/۴۰
〃 〃 〃 کلاں	۶/۷۵	صحابہ کی انقلابی جماعت	۲/-
سیرت خاتم الانبیاء	۲/-	[illegible] مدینہ کی صاحبزادیاں	۱/۲۰
سیرت خیر العباد	۱۲/-	تابعین	۱۴/-
خلفائے راشدین	۱۱/۹۰	اہل کتاب صحابہ و تابعین	۴/-
سیرت عمر بن عبد العزیز	۶/۷۵	جو بڑے آدمی	۴/۲۵
سیرت النعمان	۶/-	حیات وحید الزماں	۵/-
امام رازی	۱۲/۵۰	حیات سلیمان	۲۷/۵۰
مہاجرین اول	۱۲/۵۰	حیات شبلی	۲۶/۵۰
〃 دوم	۱۱/-	علمائے حق اور ان کی داستانیں	۷/-
سیر انصار اول	۱۲/۵۰	غدر کے چند علماء	۲/۵۰
〃 دوم	۷/۸۰	علمائے ہند کا شاندار ماضی مکمل	۳۴/۵۰
المامون	۷/۸۰	صدر یار جنگ	۱۲/-
ولی کامل	۷/-	اخوان خلیل	۳/۵۰
الغزالی	۷/۸۰	سیرت حبیب	۶/-
سوانح مولانا یوسف کاندھلوی	۱۵/-	[illegible] ثلاثہ	۱۱/۵۰

تاریخ کے موضوع پر مستند و شاہکار کتابیں

- تاریخ اسلام شاہ معین الدین ۵۳/-
- تاریخ اسلام - اکبر شاہ خاں ۴۰/-
- تاریخ ملت کامل ۱۱ حصے ۷۵/۷۵
- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ۸/-
- تاریخ ادبیات ایران غیر مجلد ۲۰/-
- تاریخ ہند پر نئی روشنی ۵/-
- تاریخ الفخری ۱۵/۷۵
- تاریخی مقالات ۱۰/۷۵
- تاریخ دولت عثمانیہ مکمل ۲ حصے ۳۰/-
- تاریخ اندلس اول ۱۲/-
- تاریخ فقہ اسلامی اول ۱۲/۲۰
- یادوں کی دنیا ۱۷/۲۵
- تاریخ گجرات ۱۲/۵۰
- اسلام اور عربی تمدن ۱۳/۷۵
- اسلام کا سیاسی نظام ۹/۴۰
- ہندستان اسلامی عہد میں ۱۲/-
- عہد مغلیہ مسلمان اور ہندو ۱۶/۶۰
- مختصر تاریخ ہند ۶/۲۵
- ہماری بادشاہی ۶/۲۵
- ہندستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک ۱۶/۲۵
- ہندستان میں عربوں کی حکومتیں ۸/۷۵
- ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے ۲۰/۲۵

فقہ وفتاویٰ اور مسئلہ مسائل پر اہم کتابیں

- رکعات تراویح ۲/-
- رکعات تراویح جدید ۴/-
- فتاویٰ رشیدیہ کامل ۱۸/-
- فتاویٰ رحیمیہ اول ۱۷/-
- 〃 〃 دوم ۲۰/-
- 〃 〃 سوم ۲۰/-
- علم الفقہ مکمل مجلد ۴۱/-
- امداد الفتاویٰ ۳۰/-
- آلات جدیدہ کے شرعی احکام ۲/۷۵
- مسئلہ سود ۳/-
- مسئلہ ختم نبوت ۳/۲۵
- مسئلہ تعدد ازدواج ۰/۶۰
- بہشتی ثمر مکمل سٹ ۶/-
- فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۹۸/-
- فتاویٰ عالمگیری ۲۲ قسط ۸۸/-
- نور الہدایہ ترجمہ ہدایہ فی قسط ۴/-
- تاریخ علم فقہ ۲/۵۰
- اصلاح الرسوم ۴/-

اکابر ومشائخ کے تذکرے، مکتوبات، ملفوظات اور مقالات

- تذکرہ مجدد الف ثانی ؒ ۱۲/-
- تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن ۴/-
- تذکرہ شاہ علم اللہ ۵/-
- تذکرۃ الخلیل ۱۳/۵۰
- تذکرۃ الرشید ۲۳/۵۰
- تذکرۃ المحدثین ۱۲/۷۵
- تذکرہ شیخ الہند ۶/-
- تذکرہ مخدوم صابر کلیری ؒ ۳/-
- شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ۱۲/-
- مکاتیب احمد سعید ۳/-
- اکابر کے خطوط ۸/-
- ارشاد السالکین ۲/۵۰
- مکتوبات تصوف اول مجلد ۴/-
- 〃 دوم ۴/- سوم ۳/-
- مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۵/-
- مکاتیب شبلی ۱۸/۷۵
- صحبتے با اولیاء ۷/۵۰
- صحبتے با اہل دل ۸/-
- مواعظ حسنہ ۸/-
- ملفوظات مولانا الیاس ؒ ۳/۵۰
- ملفوظات شیخ الاسلام ۲/۵۰
- مقالات شبلی اول تا ہشتم [illegible]
- مقالات امینی ۵/-
- خطبات شبلی [illegible]
- ارشاد الملوک مع اکمال الشیم ۱۰/-
- خطبات ماثورہ ۳/-
- مقالات احسان ۱۵/۷۵

رد بدعت وقادیانیت پر بہترین کتابیں

- رد بدعت ۲/-
- آئینہ بدعت ۱/۳۰
- بدعت کی باتیں ۵/-
- بریلی فتنہ کا نیا روپ ۶/۵۰
- فیصلہ کن مناظرہ ۲/۵۰
- شاہ اسمٰعیل شہید ؒ ۲/۵۰
- وہابی کی پہچان ۰/۳۰
- براہین قاطعہ ۶/-
- تقویۃ الایمان ۱۲/-
- چالیس بدعتیں ۰/۸۰
- تحریک وہابیت پر ایک نظر ۰/۷۵
- قادیانی مسلمان کیوں نہیں ۳/-
- تحفۃ القادیان ۲/۵۰
- قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ ۰/۸۰
- تحقیق لاثانی ۶/۵۰
- عشرۂ کاملہ ۶/-

حج بیت اللہ اور نماز سے متعلق کتابیں

کتاب	قیمت
آپ حج کیسے کریں	۴/-
آسان حج	۱/۲۵
فضائل حج	۴/۵۰
رفیق حج	۲/۷۵
معلم الحجاج	۱۰/-
حجۃ الوداع	۱/۷۵
حج کا مسنون طریقہ	۲/۵۰
حج کی باتیں	۲/-
تجلیات کعبہ	۵/-
تجلیات مدینہ	۴/۵۰
سفر حجاز	۵/-
اعیان الحجاج	۵/۵۰
سب سے پہلا سفرنامہ حج	۳/-
حج و مقامات حج	۵/-

نماز

کتاب	قیمت
کتاب الصلوٰۃ مجلد	۲/-
نماز کی حقیقت	۱/۵۰
فضائل نماز	۱/۷۵
میری نماز	۲/۵۰
نماز مترجم	-/۳۰
نماز کی باتیں	۳/-
آئینہ نماز	۲/۵۰
آسان نماز	۱/۵۰
عورتوں کی نماز	۱/-
نماز کیسے ہے ؟	-/۴۰

تبلیغی کتابیں

کتاب	قیمت
تبلیغی نصاب اول، پلاسٹک	۱۴/-
〃 دوم پلاسٹک	۱۰/۵۰
تبلیغ دین	۴/۵۰
تبلیغی جماعت پر اعتراضات کا جواب	۵/-
تبلیغی تقریریں	۱/-
تبلیغ کیا ہے ؟	۳/۷۵
تبلیغی سات نمبر	۲/۲۵
چھ باتیں	۱/-
تبلیغی تحریک کے بنیادی اصول	۳/۵۰
مفتاح التبلیغ	۴/-
تبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں	۱/۵۰

کچھ ادبی کتابیں

کتاب	قیمت
شعر العجم مکمل	۴۳/۲۵
شعر الہند مکمل	۲۹/-
شعلۂ رقصاں	۴/۵۰
غزل انسائیکلوپیڈیا	۲۵/-
فن شاعری	۳/-
فریب تمدن	۱۲/-
گل رعنا	۱۲/۲۵
اقبال کامل	۱۲/۵۰
مکاتیب شبلی مکمل	۱۸/۷۵

فضائل و حقوق

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
فضائل اسلام	۱/۲۵	فضائل درود	۲/۲۵
فضائل قرآن	۱/۵۰	فضائل استغفار	-/۵۰
فضائل نماز	۱/۵۰	فضائل اذان و اقامت	-/۶۰
فضائل رمضان	۱/-	میاں بیوی کے حقوق	-/۷۵
فضائل حج	۴/۵۰	حقوق الزوجین	۳/۲۵
فضائل صدقات	۱۲/-	والدین کے حقوق	۱/-
فضائل ذکر	۳/۲۵	حقوق البیت	۱/۲۵
فضائل تبلیغ	-/۶۰	حقوق الاسلام	-/۵۰

دین کی تعلیم دینے نیز اردو سکھانے کے لیے بہترین کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
اچھا قاعدہ	-/۴۰	اچھی باتیں اول	-/۶۰
اللہ کے رسولؐ	-/۸۵	〃 〃 دوم	۱/-
حضرت ابوبکرؓ	-/۸۵	〃 〃 سوم	-/۸۵
حضرت عمرؓ	-/۸۵	〃 〃 چہارم	۱/-
حضرت عثمانؓ	-/۸۵	〃 〃 پنجم	۱/-
حضرت علیؓ	-/۸۵	〃 〃 ششم	۱/۲۵
ہمارا ایمان	-/۷۵	حضرت خدیجہؓ	۱/-
اچھے قصے	۱/۵۰	حضرت سودہؓ	-/۵۰
آسان فقہ	-/۷۵	حضرت عائشہؓ	۲/۷۵

دار العلوم ندوۃ العلماء کا جدید عربی نصاب

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
قصص النبیین مکمل	۶/۵	تمرین الصرف	۲/۲۵
القراءۃ الراشدہ مکمل	۹/۷۵	تمرین النحو	۲/۵۰
منثورات	۶/-	الادب العربی	۶/-
مختارات مکمل	۱۳/-	النبوۃ والانبیاء	۱۵/-
معلم الانشاء مکمل	۱۲/-	علم التصریف	۳/-

ہمارا پتہ: کتب خانہ الفرقان ۳۱-نیا گاؤں مغربی - لکھنؤ

ہماری تازہ ترین پیشکش

تاریخ میلاد

مؤلفہ: جناب مولوی حافظ حکیم عبدالشکور صاحب مرزاپوری مرحوم

- مجلس میلاد و قیام میلاد کی ابتدا کب اور کیوں ہوئی ؟
- اس کے موجد و مروج کون تھے اور کیسے لوگ تھے ؟
- مولود کی سب سے پہلی کتاب کون سی ہے اور اس کا مصنف کون تھا؟
- زمانۂ ایجاد سے اب تک اس میں عملاً و اعتقاداً کیا کیا تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئیں ؟
- مختلف زمانوں اور ملکوں کے علماء کرام نے اس کے بارے میں کیا رائے ظاہر کی ہے ؟
- مولود کی اصلاح کا طریقہ کیا ہے ؟

ان سب سوالات کا مدلل اور تشفی بخش جواب ــــ اور ــــ مروجہ مجلس میلاد اور قیام میلاد کی مکمل تاریخ اور مفصل سرگذشت ــــ اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ اور خوبصورت گردپوش سے مزین ــــ قیمت صرف ۵/

ناشر

الفرقان بک ڈپو

۱۳۱- نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ

Regd. No. 1 LW/NP-62

Monthly AL-FURQAN 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

Vol. 45 Nos. 4,5,6 SPECIAL ISSUE, 1977. Phone : 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1